قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جون 2021ء

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

(اقبالؒ)

تعارف: غلام احمد پرویز

بٹالہ لاہور

(بشکریہ تحریک پاکستان گولڈ میڈل 1989ء

مطبوعہ: شعبہ تحریک پاکستان محکمہ اطلاعات وثقافت حکومت پنجاب)

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش 9 جولائی 1903ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور 1955ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائی اقبالؒ ہونے کے ناطے، آپ 1930ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

1937ء کے موسم گرما میں، علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیام شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کیے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء، مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اس مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگریس اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا، اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے، اس لیے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لیے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے،

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جون2021ء

جلد 74 شمارہ نمبر 6

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50روپے فی پرچہ

پاکستان: 600روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قرآن کے مجوزہ نظامِ حکومت کا خاکہ	ادارہ	4
قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	پرویزؒ	6
اُسوہ حسنہ (مسلسل)	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	32
''بچوں کی تربیت'': کیا واقعی بچے تو پل ہی جاتے ہیں؟	نبیلہ حارث، کراچی	38
فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے	خواجہ ازہر عباس، کراچی	46
دوقومی نظریہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	54

ENGLISH SECTION

Is Sexual Relationship a Private Matter? By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کے مجوزہ نظامِ حکومت کا خاکہ

(نہ حزبِ اقتدار نہ حزبِ اختلاف، نہ سیاسی پارٹیاں نہ مذہبی پارٹیاں)

دین میں جب مذہبی فرقے نہیں ہوں گے تو الگ الگ سیاسی پارٹیاں کس طرح وجود پذیر ہوسکیں گی؟ مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی کی تفریق مذہب میں ہوتی ہے جس میں سیاست اور مذہب الگ الگ ہوتے ہیں دین کے اندر سیاست اور مذہب میں کوئی تفریق نہیں ہوتی اس لئے اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ اس میں اُمتِ مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی ہوتی ہے خود اس اُمت کے اندر پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس کے ایوان میں، اُمّت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک حزبِ اقتدار اور ایک حزبِ اختلاف۔

قرآنِ کریم نے تمام نوعِ انسان کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مومن اور دوسری کافر۔ انہی کو وہ دو حزب کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزبِ الشیطٰن (58:19-22) اسلامی مملکت کے ایوان (پارلیمان) میں تمام کے تمام ارکان وہ ہوں گے جو قرآن کریم کے عطا کردہ اصول واقدار پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کا فریضہ ان اصولوں واقدار کو قانونی شکل دے کر ملک میں نافذ کرنا ہے۔ اس ایوان میں غور وفکر اس مسئلہ پر ہوگا کہ ان اصولوں کو موجودہ حالات میں نافذ کس طرح کیا جائے۔ یعنی یہ لوگ پارلیمان میں بیٹھ کر مملکت کے لئے اصول واقدار وضع نہیں کریں گے بلکہ صرف یہ سوچیں گے کہ ان اصول واقدار کی تنفیذ کے لئے طریقہ کونسا اختیار کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہر رکن اپنی اپنی رائے پیش کرے گا اور جو فیصلہ ہوگا اس کا اطلاق ہر ایک پر ہوجائے گا۔ اس میں حزب اقتدار کے بجائے عمالِ حکومت (کارندے) ہوں گے۔ جن کا فریضہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس فیصلہ پر ٹھیک عمل ہو رہا ہے۔

قرآنِ کریم نے تمام نوعِ انسان کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مومن اور دوسری کافر۔ انہی کو وہ دو حزب کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزبِ الشیطٰن (58:19-22)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قوموں کی تعمیر
فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!

1968-1969ء میں اس بدنصیب ملک نے ہنگاموں کا سیلاب دیکھا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔ فسادات برپا کئے گئے۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ساری قوم جذبات کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ اس کے بعد فضا میں قدرے سکون پیدا ہوا تو پرویزؒ صاحب نے، طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر 1970ء میں ایک نہایت بلیغ، بصیرت افروز اور فکر انگیز خطاب پیش کیا جس نے ملک کے اربابِ دانش وبینش کو بے حد متاثر کیا۔ یہ خطاب طلوع اسلام میں بھی شائع ہوا، اور اس کا الگ پمفلٹ بھی چھاپا اور ملک میں عام تقسیم کیا گیا۔ اب پھر مختلف گوشوں سے تقاضے موصول ہوئے کہ اس خطاب کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ ان تقاضوں اور اس خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

خطاب

صدر گرامی قدر و عزیزان محترم۔ سلام و رحمت!

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم، بنیادی) فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبہ محرکہ، جبلّی تقاضا۔۔۔(Instinctive Urge) ہوتا ہے۔۔ اسی کو آگے بڑھ کر انسانی زندگی میں، جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔۔ حیوانات کے برعکس، انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کرے، اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا، دلائل و براہین کی رو سے، موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر، اس کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالے، اور اس طرح، امکان بھر تدبر و فکر کے بعد، نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیش نظر مقصد کے راستے میں

جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدت آ جاتی ہے۔۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ اس کا غصہ تیز ہو جاتا ہے۔۔اس لئے کہ اُس کے پاس اِس کے سوا مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون و اطمینان سے ان کا حل سوچے۔حیوانات کے جبلی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی، جب تک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو، یا اسے بھوک نہ ستائے، کسی پر حملہ نہیں کرتا۔جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اسے اس کی پروا نہیں رہتی کہ باقی ماندہ چارہ کون کھا رہا ہے۔حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی جسے جبلی تقاضوں میں شدید ترین تصور کیا جاتا ہے فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔

فطرت کا کنٹرول نہیں:

لیکن انسان کے جبلی تقاضوں یعنی جذبات پر فطرت نے اپنا کنٹرول عائد نہیں کیا۔اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عائد کرنا پڑتا ہے اور یہ کنٹرول عقل وفکر کی رو ہی سے عائد کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا، عقل وفکر اور دانش وبینش، باعثِ شرفِ آدمیت اور موجبِ جوہرِ انسانیت ہیں اور جبلی تقاضوں (جذبات) کی بے باکی، حیوانیت سے بھی پست سطحِ زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے۔انسان، حیوانات کے مقابلے میں بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔۔۔نہ اسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے، نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔نہ یہ ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے، نہ عقاب جیسا بلند اڑ سکتا۔۔۔لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل وفراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان یکساں واجب التکریم پیدا ہوئے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں ''میری اور تیری'' کی تفریق وتخصیص پیدا ہوئی تو اُن لوگوں نے جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبۂ حرص وآز کو قیود ناآشنا بنانا چاہتے تھے اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (Exploit) کیا جائے۔انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجبثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل وفکر سے عاری ہوتے ہیں۔اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرماں پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل وفکر سے بے گانہ بنا دیا جائے۔

اُن لوگوں نے جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبۂ حرص وآز کو قیود ناآشنا بنانا چاہتے تھے اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (Exploit) کیا جائے۔انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجبثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل وفکر سے عاری ہوتے ہیں۔اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرماں پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل وفکر سے بے گانہ بنا دیا جائے۔

جائے۔ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج' اور رفتہ رفتہ مصلوب کر دیا جائے۔۔۔

اس نظام کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل وفکر کے چراغ گُل کئے جاتے ہیں' مذہب کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اس لفظ کو سن کر شائد چونک اُٹھیں کیونکہ مذہب کا تصور تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔ مذہب' نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل وفکر' کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع فرمان بنائے مذہب کہلاتا ہے' خواہ وہ دہریت ہی کا نظام کیوں نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دینؔ اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔

عقول کی جنگ:

آپ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں' باہمی کش مکش (Battle of Wits) یعنی عقول کی جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ حاکم ومحکوم' آمر و مامور' مطاع ومطیع' مقتدیٰ ومقتدی' آجر ومستاجر' محتاج ومستغنی کی تفریق وتمیز' اسی کش مکش پیہم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طرز یقے وضع کئے جن سے ان لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل وفہم کے مالک تھے' اپنے دامِ تزویر میں لے آئے' اور اس طرح گوشہء سیاست میں حاکم وآمر' دنیائے مذہب میں مطاع ومقتدیٰ اور جہانِ معیشت میں رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی اور اَن داتا بن بیٹھے۔ اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم ومطیع ومحتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں ابھرنے نہ پائیں۔

اسے مذہب کہتے ہیں:

اس نظام کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل وفکر کے چراغ گُل کئے جاتے ہیں' مذہب کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اس لفظ کو سن کر شائد چونک اُٹھیں کیونکہ مذہب کا تصور تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔ مذہب' نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر' کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع فرمان بنائے مذہب کہلاتا ہے' خواہ وہ دہریت ہی کا نظام کیوں نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دینؔ اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ:

دین خداوندی:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔۔۔ خواہ اسے ضابطہء قوانین' حکومت اور نبوت بھی حاصل کیوں نہ ہو۔۔۔ کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں' بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار، لا الہ الا اللہ کے نظریہء حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دُنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ سب سے پہلے اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب، استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد)، ہامانیت (مذہبی اقتدار)، اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت۔ وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا اور ان برفانی سلوں کو اٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآنِ کریم نے جب حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (7:157) تو اس کا مفہوم یہی تھا۔ یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے، وہ ایسا انتظام کرے گا کہ اس کی فکری صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جائیں تا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر، اس کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔

عقل و فکر کی عظمت:

آپ قرآنِ کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی اہمیت اور فہم و فراست کی عظمت، تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ آؤ! تمہیں بتائیں کہ جہنم کے مستحق کون لوگ ہیں۔ وہ کہ: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫۔ جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں، لیکن عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ یہ لوگ، انسان نہیں۔ حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (7:179) اس لئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آ گئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے، ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۰﴾ (67:10) اگر ہم ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم میں کیوں ہوتا۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بیباک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل و فکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنم ہے جس سے تمہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (36:67) آسمانی انقلاب کے اس پیامبر عظیم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ (12:108) میں جو تمہیں خدا کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ تم اس پر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں، جبر و استبداد نہیں۔ وَقُلِ الْحَقُّ

مِنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۭ (18:29) اے رسول ﷺ! تم ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

دین میں جبر نہیں:

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ (2:256) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم سے دین بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر و اکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ شدید جور و اکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو مفلوج کر کے کسی سے کوئی بات منوا لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیر العقول کرامات کے زور سے نہیں منواتا۔ قرآن کے اولین مخاطب جو مذہب کے خوگر تھے، رسول اللہ ﷺ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوت، حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، تم سے اپنی بات منوا لوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو! چنانچہ آپ ﷺ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ (17:36) سماعت، بصارت اور فہم و ادراک، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسولؐ اللہ اپنی دعوت کو عقل و بصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخالفین سے کہتے کہ: هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (2:111) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں، نہ تم منواؤ۔ میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہوں، تم اگر اسے رد کرتے ہو تو تم بھی دلیل و برہان کی رو سے ایسا کرو۔

سوچا کرو:

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے، اس کے لئے آپ ﷺ نے مختلف طُرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس تعلیم کی وسعتیں حدود فراموش اور اس کے موضوع قیود ناآشنا ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات۔ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آ جائے ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ ﷺ ان سے کہتے ہیں کہ: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى

وَفُرَادٰی اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب رکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے ہی رک جاؤ اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپ ﷺ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں' یہ ہے کہ: ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ (34:46) تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بینش سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہو گیا۔

مومن کسے کہتے ہیں:

آپ کو عزیزان گرامی قدر! معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان' مومن نہیں کہلا سکتا۔ سنئے' اور غور سے سنئے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ (25:73)

مومن وہ ہیں کہ اور تو اور' جب ان کے سامنے آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ہمارے ہاں لفظ ''ایمان'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ (Faith) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (Faith) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اس اعتراف حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد' عقل و فکر کی رو سے' کیا جائے۔ اسے آپ (Conviction) کہہ سکتے ہیں۔'' مذہب کی بنیاد (Faith) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت (By Conviction) اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ: ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

(اگر پیر مغاں کہے تو مُصلّیٰ کو شراب سے رنگین کر دے۔ کیوں کہ سالک منزل کی راہ و رسم سے غافل نہیں ہوتا۔)

اور دین یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف' تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین' درحقیقت' مذہب کے خلاف چیلنج ہے۔ ضمناً' اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ میں نے جو اپنی کتاب کا نام (Islam A Challenge To Religion) رکھا ہے تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی ہے۔

جذبات، عقل اور وحی:

قرآن کریم نے' جذبات' عقل اور وحی کے تعلقات کو' دو آیات میں' اپنے مخصوص' حسن ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے اس شخص' یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ: وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً اور اس کے سننے' دیکھنے' سمجھنے' سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ (45:23) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا

ہے؟ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا' اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی بڑی وسیع وعریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں۔ علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدار خداوندی کے تابع نہ رکھا۔ فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ سَمۡعُہُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُہُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ (46:26) جب انہوں نے اقدار و قوانین خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوام مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے۔ علم و عقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی اور قوم شاید ہی اس بلندی پر پہنچ پائی ہو اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی یہ کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جسے اطمینان نصیب ہو۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدار خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عصر حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ:

عشق ناپید و خردمی گزدش صورت مار[1] — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل و بصیرت سے اقدار و قوانین خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رو سے عطا ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

دین کا نظام:

یہ تھا وہ دین جسے خدا نے نوع انسان کی راہنمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں حضور نبی اکرم ﷺ نے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (1) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا۔ اس میں تمام افراد قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (2) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (3) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا اور (4) انسانی عقل و فکر پر وحی کی مستقل اقدار کے سوا کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی فکر کو اپنی نشوونما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے صفحہء ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور کیفیت یہ تھی کہ:

---

(1) ''عشق'' ناپید ہے اور عقل/خرد اس کو سانپ کی صورت ڈستا ہے۔ اردو ترجمہ از سلیم)

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے تھے　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا' مہِ کامل نہ بن جائے

دین کی جگہ مذہب:

یہ نظام تھوڑی دور چلا تھا کہ استحصالی قوتوں (Forces of Exploitation) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ پھر سے مذہب نے لے لی۔ میں اس وقت' عزیزانِ من! اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب وعلل کیا تھے؟ یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے اور اگر میں نے اسے اس مقام پر ضمناً چھیڑا تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلت وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائیں گے۔[1]

بہرحال' سلب ونہب کی قوتیں پھر ابھریں اور دین کے خلاف نبرد آزما ہوگئیں۔ ان کے پیش نظر اولین مقصد یہ تھا کہ عقل وفکر کی شمعیں گل کر دی جائیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا' یہ پھر تاریخی تفصیل ہے جس میں' میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت' میں صرف اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں' اشاعرہ اور معتزلہ کی کش مکش کو یوں بیان کر کے آگے بڑھایا جاتا ہے گویا وہ دو فرقوں کے عقائد کی آویزش تھی' وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کش مکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پاس دلیل وبرہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پراپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے' عوام اس کے خلاف امنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں' اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے' یورپ کی اس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہو گا جس میں مذہب اور عقلیت (Rationalism) کی معرکہ آرائیاں' انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آ جائے۔ مذہب کی عقل پرستی کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت وبربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے' خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو' اور فریق مقابل کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔

گوئٹے نے کہا ہے کہ سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آ جائے۔ مذہب کی عقل پرستی کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت وبربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے' خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو' اور فریق مقابل کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔

تصوف اور عقل

ہماری تاریخ میں بھی' عقل وفکر اور علم وبصیرت کے چراغ گل کرنے کے لئے اسی قسم کے جھکڑ چلے۔ اس میں افراد کے

(1) پرویزؒ صاحب نے اب اسے اپنی معرکہ آرا تصنیف ''شاہکار رسالت، عمر فاروق'' کے آخری باب میں بڑی تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ساتھ کیا ہوا' اسے تو چھوڑ یئے' انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک ورق تلف کر دیا گیا۔ جب اس بحران میں ذرا کمی ہوئی' تو رہی سہی کسر تصوف کی برفانی سلوں نے پوری کر دی۔ تاریخ فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اس نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم' قطعاً قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ قابل اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوف' دونوں نے مل کر' علم وعقل کے چراغ گل کر دیئے اور اس کا نام دین کی خدمت رکھا۔ لاک نے کہا تھا کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتے ہیں وہ درحقیقت عقل اور وحی دونوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال ہے۔ یہاں عقل وفکر کے چراغ گل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں' ان سے یہ چراغ تو گل ہوئے ہی تھے' ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیل جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں پر باقی رہ گیا۔

میں ابھی ابھی' برادرانِ گرامی قدر! ان معرکہ آرائیوں کا ذکر کر رہا تھا جو گذشتہ چند صدیوں میں یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کش مکش میں بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہوئی اور مذہب کو گرجوں کی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کا وہاں یہی حشر ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے۔ مذہب' صرف مذعومہ ''خدا پرستی'' کا نام نہیں۔ مذہب' ہر اس تحریک کو کہتے ہیں جو علم وعقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطہء نگاہ سے دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقع ہوا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

عوامی تحریک:

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آ گیا۔ اس کے اس جدید لبادہ کا نام' عوامی تحریک یا (Mass Movement) ہے۔ جس طرح دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ' سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں' اسی طرح مذہب کا یہ جدید لبادہ' اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نازی ازم' فاشزم' کمیونزم وغیرہ عوامی تحریکات' مذہب کے انہی جدید لبادوں کا نام ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ' یا شورش یا ہیجان (Agitation) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی کاروان انسانیت کا' عقل اور وحی کی روشنی میں' آہستہ آہستہ' نسیم سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت

خیز تخریب کے بعد وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں۔۔یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ: ؎

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے! عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ایک تو یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔دوسرے اس دور میں عام وسائل رسل ورسائل کی فراوانی ہے۔اس کی وجہ سے دنیا کا کوئی حصہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔جب ان کے اثر ونفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے متاثر رہتے اور اصل تو یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ان کے ہاں صدیوں سے مذہب یعنی عقل و فکر کے خلاف جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔یہ تو وہ ''بھک سے اڑنے والا'' مادہ (Explosive) تھا جسے صرف فتیلہ دکھانے کی دیر تھی کہ وہ شعلہء جوالہ بن جاتا۔

ہندی مسلمانوں کی زندگی:

آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالئے۔اگر آپ اس مطالعہ کی ابتداء جنگ بلقان اور طرابلس سے کر کے، 1935-1936ء تک دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی۔ اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن یہ خود بعد یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیں گے تو آپ آتش سیال کا طوفانی دریا تھی جو ذرا ذرا سے سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا لیکن شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں اور دیکھنے شرر باریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی لیکن کچھ عرصہ کے کر اٹھتا اور ساری فضا کو طوفان آمیز کر دیتا۔اس طوفان بلا خیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہان ناسازگار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر انہیں خس وخاشاک کی طرح نذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوجاتا کہ یہ طوفان انگیزی بس بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہوگیا۔لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔اس کے بحر بے کراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہان پیر کی موت قریب آ گئی ہے اور اس سیل بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد، یہ مضطرب و بے قرار موجیں باہم گر ٹکرا کر غرق دریا ہوجاتیں اور سطح آب پر ان کا نقش قدم تک دکھائی نہ دیتا۔اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مذہب پرستی سے اس کی عقل وفکر کی صلاحیتیں شل ہوچکی تھیں اور یہ ہمہ تن جذبات بن کر رہ گئی تھی۔سرسید نے ؎ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟ تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی،

سرسید نے ؎ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟ تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغ تہ داماں بنا دیا۔

کی کوشش کی، لیکن مذہب پرستی کے جھگڑوں نے انہیں چراغ تہ داماں بنا دیا۔

اقبالؒ کا پیغام:

اقبالؒ نے جب اس قوم کی ان بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلاتعین منزل، صحرانوردیوں پر نگاہ ڈالی تو اس کے دل درد مند سے اک ہوک اٹھی اور اس نے 1930ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے مشہور خطبہء صدارت میں، اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا اور قوم کو اس پر متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی لیکن قوم، جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدان راہ حیات کی اس صدائے رحیل کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسے ایک شاعر کا تخیل اور دیوانے کا خواب کہہ کر حوالہء طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہو گئی۔ 1932ء میں جب اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبہء صدارت کے آغاز میں قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ:

> اگر ان حالات میں ہمارے لیڈروں نے قوم کے لئے کوئی متعین راہ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادث زمانہ کے سیل بے پناہ میں بلا سوچے سمجھے کود پڑے گا۔

تو دوسری طرف سے ایک نوجوان، انتہائے جوش و خروش میں، یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ:

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہ نے فرمایا کہ:

> ان شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکری صلاحیت نہیں رہتی، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

قائداعظمؒ:

ان کے اپنے الفاظ جو میرے خیال میں آج پاکستان کے ہر در و دیوار پر تابندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں، یہ تھے کہ (Where There is no Vision People Perish) اقبالؒ کی یہ آواز بظاہر قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقار خانہ میں گم ہو کر رہ گئی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ (No True Voice is Ever Lost) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے اسے ان ہنگاموں سے دور بیٹھے سنا اور اپنے صدف قلب میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ

تھا قائداعظم محمد علی جناحؒ وہ محمد علی جناحؒ جو فکر و تدبر کا مجسمہ متانت و سنجیدگی کا پیکر، صداقت و دیانت کا فشردہ اور اقبالؒ کی اس مقدس دعا کا حسین امین تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ:

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا بااضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

(اے خدا اگر مجھے بے حد و بے کنار سمندر کا مدّمقابل بنانا ہے تو پھر مجھے موج کے اضطراب کے ساتھ ساتھ موتی کا سا سکون بھی عطا کر دے۔)

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا جو قرآنی فکر کی روشنی میں، سکوتِ دریا میں بط کی سی خاموشی کے ساتھ جانب ساحل رواں دواں چلی جا رہی تھی۔۔ مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار۔۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے دس سال کی قلیل ترین مدت میں ایک قطرہ ءخون بہائے بغیر۔۔ حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی دیئے بغیر۔۔ پاکستان جیسی وسیع و عریض مملکت حاصل کر لی گئی اور اس طرح ثابت کر کے دکھا دیا گیا کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں، جن کی کیفیت یہ ہو کہ:

نگہ بلند، سخن دِلنواز، جاں پُرسوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی لیکن جس طرح یورپ میں مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد عوامی تحریکوں کا پیکر اختیار کیا تھا بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی وہ مذہب جو تحریک پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا پاکستان میں ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا اور ملک کی فضا کو آندھیوں اور جھکڑوں کی آماجگاہ بنائے چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

(پرویز صاحب نے اس مقام پر ان آندھیوں اور جھکڑوں کی کچھ مثالیں پیش کی تھیں، لیکن حالیہ ہنگامے اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لے آئے ہیں کہ اس موضوع پر ضمناً کچھ لکھنا مفید نہیں ہو سکتا۔ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے جس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ بنابریں اس مقام پر ان مثالوں کو حذف کر کے ہم عوامی تحریکوں کی اس اصولی بحث سے سلسلہ ءکلام کا اجراء کرتے ہیں جس سے پرویز صاحب نے بات آگے بڑھائی تھی۔)

عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (Chaos) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل وفکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے۔

عوامی تحریک کے عناصر:

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی تحریکیں کن عناصر سے

ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اورلزومات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا کیا طریق اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے پیشِ نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ اسے کامل غور وفکر سے سماعت فرمائیں گے۔

(1) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (Chaos) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل وفکر اور غور وتدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے ایسے لوگوں کو مذہبی دیوانے (Religious Fanatics) کہا جاتا ہے۔

(2) عوامی تحریک میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں، اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ یوں تو طبقاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہوگیا تھا جب ابلیس نے ابن آدم کے کان میں ''میری اور تیری'' کا افسوں پھونکا تھا لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (Haves) اور (Have-Nots) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (Present) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذبات نفرت کو مشتعل کئے چلے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار، معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔

> اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ۔۔ وہ آئی، لو وہ آئی، دل ناصبور صبح۔۔ ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے انہیں جلدی سے تباہ کر دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (Tempo) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

(3) اس تحریک کے علمبردار حال کو اس قدر قابل نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اس قدر درخشندہ وتابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محروموں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کر دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس

طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے۔ اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا تو وہ دیوانہ وار لپک کر ان کے پیچھے ہولیں۔

عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (Thermos) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں؟ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے تو وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ۔۔عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔۔!

(4) عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے مستقبل کے فریب تخیل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اصطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (Followers) قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو وہ بددل ہو جاتے ہیں۔

(5) اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ۔۔ وہ آئی' لو وہ آئی' دل ناصبور صبح۔۔ ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے انہیں جلدی سے تباہ کر دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (Tempo) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور یہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دور نہیں۔ اس ضمن میں اس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دور رکھا جاتا ہے۔ اگر اسے لمبے فاصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آ سکتا۔ اسی لئے عوام سے کہا جاتا ہے کہ تم اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو؟ پھر دیکھو کہ ہم کس طرح اس نظام کو کل ہی واپس لے آتے ہیں جسے دیکھنے کو تمہاری آنکھیں ترستی ہیں۔

(6) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے۔۔ ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

(7) عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس

جماعت میں شامل ہونے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (Complexes) کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی طرح یہ لوگ اپنی پارٹی کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(8) عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (Thermos) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں؟ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے تو وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ۔۔عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔۔!

(9) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے امر لابنفک ہے کہ عوام کو مسلسل مصروف حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جائے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہو گا تو کسی دوسرے عوامی تحریک ہی میں شامل ہو گا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغہ ژائی کا اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رخ نہیں کرتا۔

(10) مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (Faith) کہتے ہیں۔ (Faith) کی وضاحت برگسان نے بڑے جامع انداز میں کی ہے۔ جب کہا ہے کہ (Faith) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں۔ (Faith) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔ عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

عوامی تحریک کے لیڈر:

یہ تو رہے عزیزانِ من! عوامی تحریک (Mass Movement) کے لزوم و خصائص۔ جہاں تک اس تحریک کے

لیڈر کا تعلق ہے اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً:

(1) وہ اصول پرستی کی جگہ حکمت عملی کو اپنا مسلک قرار دے یعنی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جس مصلحت کا تقاضا ہو بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرا دے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

(2) اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس ''کہہ مکرنے'' کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

(3) وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو۔ خواہ اس کے لئے اسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں۔۔ اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا حسن عمل قرار پائے گا اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

(4) اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے نہ کسی دوسرے کی بات مانے۔ وہ اپنے آپ کو ہمہ دان اور محیط کل سمجھے۔

(5) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود اور اس طرح اسے (One Man Show) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو کبھی بار نہیں پانے دے گا۔ جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہم دوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد طبقاتی تفاوت کی شدت احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقے کی سطح کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹایا گیا ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو ابھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں۔۔ اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر

> میری چشم تصور کے سامنے بعض پیشانیوں کی وہ خشم آلود شکنیں آ رہی ہیں جو انتہائی غم و غصہ کے عالم میں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ غلط نظام کیوں مٹ گیا؟ میں اس سوال کا تفصیلی جواب تو ذرا آگے چل کر دوں گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں اس غلط نظام کے مٹنے کا افسوس نہیں کر رہا غلط نظام کو مٹنا ہی چاہئے مجھے افسوس ہے اس غلط طریق کا جو اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ غلط کو غلط سے مٹایئے تو غلط پھر بھی موجود رہے گا۔ صرف اس کے پیکر میں فرق آ جائے گا۔

نہیں آتے۔سب تاریکی کی چادر میں گم ہوجاتے ہیں۔

یہ ہیں عزیزان من! وہ عناصر جن سے ایک عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے یعنی یہ کہ عقل وفکر کے چراغوں کو گل کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار وانتشار (Chaos) برپا کیا جائے اور ایسا کرنے کو خدائی فریضہ قرار دیا جائے۔

کوئی تعمیری کام نہیں:

میں یہ عرض کررہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں مذہب کے نام پر ایک عوامی تحریک کی طرح ڈال دی گئی۔ملک میں بدقسمتی سے غلط نظام زندگی اور ارباب نظم ونسق کی بدعنوانیوں سے جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی ابھرتے چلے گئے۔آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔اس کے برعکس اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔یہ مسلسل (Chaos Create) کرتے رہے۔

بحالی جمہوریت:

یہ تحریک بڑھتی تو گئی لیکن جن خوش آئند وعدوں سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا گیا تھا ان کے ایفا ہونے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا کہ اس کے بعد اس کا (Tempo) قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔اس وجہ سے اسے اپنا رخ دوسری طرف موڑنا پڑا اور ''بحالی جمہوریت'' کے نام سے اس میں نیا ایندھن ڈالا گیا اور پھر اس روڈ رولر نے جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا جو تباہی مچائی اس کے نشانات اب تک اس ملبے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس کے نیچے علم وعقل، ہوش وخرد اور تہذیب وشرافت کی لاشوں کو دبایا گیا۔(1)

عزیزان من! میں کہہ یہ رہا ہوں اور میری چشم تصور کے سامنے بعض پیشانیوں کی وہ خشم آلود شکنیں آرہی ہیں جو انتہائی غم وغصہ کے عالم میں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ غلط نظام کیوں مٹ گیا؟ میں اس سوال کا تفصیلی جواب تو ذرا آگے چل کر دوں گا۔یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں اس غلط نظام کے مٹنے کا افسوس نہیں کررہا غلط نظام کو مٹنا ہی چاہئے مجھے افسوس ہے اس غلط طریق کا جو اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔غلط کو غلط سے مٹایئے تو غلط پھر بھی موجود رہے گا۔صرف اس کے پیکر میں فرق آجائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہماری پوزیشن:

یہ ہے وہ مقام جہاں عزیزان من! ہم اس وقت کھڑے ہیں۔میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔۔میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک

(1) یہ پڑھتے وقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ خطاب، 1968-1969ء کے ہنگاموں کے بعد، 1970ء میں پیش کیا گیا تھا۔(طلوعِ اسلام)

ہے اور سیاسی پارٹیاں حکمت فرعونی کی مظہر۔ میری تحریک یکسر فکری ہے اس لئے ہم عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں نے جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے وہ نہ کسی پر تنقید ہے نہ کسی کی تنقیص۔ یہ میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہاں کے حالات کا معروضی۔۔(Objective) تجزیہ ہے۔ مجھے دین سے عشق ہے اور پاکستان سے اس لئے محبت کہ یہ سرزمین دین کا نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی اور اس کے حصول کی جدوجہد میں، میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تھا۔

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں:

تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں، عقل وفکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب وتمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلاب بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں پھر نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکت پاکستان جو ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی۔۔ جب 1968-1669ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دودھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب 1942ء میں مسٹر گاندھی نے (Quit India) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بے باک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی قوم کو قانون کا احترام سکھائیے۔ قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رخ انگریز کی طرف ہے کل کو اس کا رخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہے گا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتشیں پر جشن مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخور اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے!

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (Lawless Ness) کی زد میں آ رہا ہے۔

باطل کے نظام:

قرآن کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعث برومندی قرار دیتا ہے اس کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل، فلہٰذا ابلیسی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔۔ وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو، اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں، سیکولر نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ فرعون تھا۔ دوسرے گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان، روٹی کے لئے دوسرے کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا۔

> رسول اللہ ﷺ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

داخلی تبدیلی:

قرآن اس کا طریقہ فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (13:11)

جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ایکہ منزل را نمی دانی ز راہ — قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد انسانی قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

(جو دل میں ہے صاف صاف کہتا ہوں۔ قرآن ایک عام کتاب نہیں یہ ''چیزے دیگر'' ہے)

(یہ جب جاں میں اترتا ہے تو جان اور ہو جاتی ہے اور جب جان اور ہو جاتی ہے تو جہان بھی اور ہو جاتا ہے۔)

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقائے جلیل کے

مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا۔ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآن کریم کی رو سے کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (Means Are Justified By Ends Achieved) میکاولی سیاست کا اصول ہے، قرآن کا نہیں۔ قرآن کی رو سے غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہئے اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضور ﷺ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظام نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پرسکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد جب وہ اس کی صداقت کے متعلق دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے۔ قرآن کریم نے جو حضور ﷺ کی یہ خصوصیت کبریٰ بیان کی ہے کہ: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط (2:129) تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضور ﷺ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے اور یہی چیز جذبہ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:

(1) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا اور

(2) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عمل تزمیل[1] (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضور ﷺ کی عمر رسالت صرف تیئس سال تھی اور آپ کا عہد رسالت

(1) رسول اللہ ﷺ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عمل تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا اور حضور ﷺ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون وسکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ وتعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے' ان کے نزدیک حضور ﷺ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دور کہلائے گی۔

اس جماعت مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار' جنگ وجدال' فتنہ وفساد' عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا' اور اس جماعت نو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابل برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکہ دیا نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی۔۔ ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا ایمان یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم اور اعمال صالحہ۔۔ قرآنی اقدار واصول کے اندر رہتے ہوئے مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحب اقتدار ہوگئی تو معاشرہ میں نظام اسلامی خود بخود نافذ ہوگیا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی منزل مقصود تک جا پہنچا۔ اس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔۔ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد' کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ میری منزل مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا' سب کچھ دیکھ بھال کر' سوچ سمجھ کر ممبر

بنا تھا۔ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا۔۔حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصد و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروف جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق صدر اول میں یہ نظام قائم ہوا۔یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں، مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہوگا جو صحیح اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہو۔

> ملک میں غریبوں پر گوشہء عافیت تنگ ہو رہا ہے۔انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چار پیسے۔ان پر ہر طرف سے مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ان کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ ان غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے اور انصاف کی آج ضرورت ہے اور آپ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے اور نہیں سمجھتے کہ۔۔تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔۔

نوجوانوں کا اضطراب:

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشہء عافیت تنگ ہو رہا ہے۔انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چار پیسے۔ان پر ہر طرف سے مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ان کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ان غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے اور انصاف کی آج ضرورت ہے اور آپ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے اور نہیں سمجھتے کہ[1]۔۔تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابی تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ان بے انصافیوں کو ملک میں آج ابھارا گیا ہے اور میں گذشتہ بیس سال سے مسلسل اس کے لئے پکار رہا ہوں لیکن اس کے باوجود، میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور

(1) جب تک تریاق (دوائی/ ویکسین) آئے گا۔سانپ کا ڈسا تڑپ تڑپ مر جائے گا۔

مریض اور تیمارداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے۔۔ ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوالائے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بو یا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے انہیں قانون کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاق حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے' ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اگر پیش نظر مقصد موجودہ نظام میں (جیسا کچھ یہ ہے) اقتدار حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے بھی نہایت پرامن آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ ملک میں معاشی تبدیلی کے لئے قانونی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا جائے لیکن اسے اپنے پروگرام کا منتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے محض عارضی تدبیر سمجھا جائے۔

چین کی مثال:

صحیح انقلاب کے لئے عزیزان من ! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار تمناؤں اور آرزوؤں' بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود' فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالب نے یہ کہا تھا کہ۔۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔۔ تو اسے اس کا بھی احساس تھا کہ۔۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب۔۔ ہماری بیتابی تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ نوجوان چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے ! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

چین کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی 20 مارچ 1970ء کی اشاعت میں انقلاب چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد' صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت

ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ سوچئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو، اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات، تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں ڈھالنا مطلوب ہے، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآنی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایئے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے انہیں قانون کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاق حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے، ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اگر پیش نظر مقصد موجودہ نظام میں (جیسا کچھ یہ ہے) اقتدار حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے بھی نہایت پرامن آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ ملک میں معاشی تبدیلی کے لئے قانونی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا جائے لیکن اسے اپنے پروگرام کا منتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے محض عارضی تدبیر سمجھا جائے۔

ایمان بالآخرۃ:

منتہیٰ.....افراد قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی قرار دی جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرۃ ہے یعنی اس حقیقت پر کامل یقین کہ انسان کا کوئی عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آ جائیں اور خواہ مرنے کے بعد۔ اس ایمان کے بعد قانون کی اطاعت یا مستقل اقدار کی پابندی نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیز اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں وہ اس وقت قائم ہوگا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسول ﷺ!) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیہ کے لئے تیری طرف رجوع کریں یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں اور اس کے بعد۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾ (4:65) اور پھر جو فیصلہ تو دے اس کے

سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔

اسلامی نظام کے قیام کی شرط:

جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل وصورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے اور ظاہر ہے کہ قلب ونگاہ میں ایسی تبدیلی، ہنگامہ خیزیوں اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہوسکتی ہے جس کا مقصد، افرادِ معاشرہ کی قرآنی خطوط پر تعلیم وتربیت ہو۔ میں نے عزیزانِ من! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے تحریک پاکستان میں، اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو اور قرآن کریم پر غور وتدبر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہوگئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے جب نونہالانِ ملت کی تعلیم وتربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے ان کی کیفیت یہ ہوجائے کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیق ایزدی اس بائیس [1] سال کے عرصہ میں کامل سکوت وسکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوعِ ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر نہایت خاموشی سے فرشِ صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے یا گوئٹے کے ''نغمۂ محمد ﷺ'' میں اس آسمانی ندی کی طرح، جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے دوآتشہ کردیا ہے کہ:

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود　　باخود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا۔۔ اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے قوم سے کہا کہ ہم جس قسم کے بھی مسلمان ہیں ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس خطہ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔

تعلیمی نظام:

اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والے نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہئے جس سے وہ اسلامی زندگی کا پیکر بن کر ابھریں۔ اس سلسلہ میں، میں نے پاکستان میں مروجہ طریق ونصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم اور اربابِ حل وعقد کی بالخصوص مبذول کرائی۔۔ اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں منہمک رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس [1] سال سے اپنی درسگاہوں، اسکولوں کالجوں، مکتبوں، دارالعلوموں میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا

---

(1) یہ 1970ء کی بات ہے۔ اب یہ تحریک بعونہٖ تعالیٰ اور بھی زیادہ پھیل چکی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملول خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے' عزیزان من! چاروں طرف سے ہار تھک کر' بالآخر یہی سوچا کہ اگر اس کے لئے قوم اجتماعی طور پر تیار نہیں ہوتی تو ہم انفرادی طور پر ایک ایسی درسگاہ قائم کریں جو اس باب میں ماڈل کا کام دے سکے۔ اس درسگاہ میں نصاب تعلیم تو وہی ہو جو یونیورسٹی تجویز کرتی ہے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء تعلیم کے عام میدان میں کسی سے پیچھے نہ ہوں لیکن اس نصاب کو پڑھایا اس طرح جائے کہ طلباء میں اس بات کے پرکھنے کی تمیز پیدا ہو جائے کہ اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کون سی چیز قرآنی نظریہء زندگی اور مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کونسی ان کے خلاف اور اس کے بعد ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآنی نظام حیات کو دنیا کے سامنے علوم حاضرہ کی روشنی میں اس طرح پیش کر سکیں کہ سننے اور سمجھنے والے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس نظام کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔

ہم' عزیزان من! آج کل اسی درسگاہ کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہیں کہ۔۔ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

یہی وہ نوجوان ہوں گے جو عوامی اور ہنگامی تحریکوں کا خس و خاشاک بننے کے بجائے قرآنی فکری تحریک کا وہ شجر طیب بنیں گے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ (14:24) اس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھولے جھولتی۔۔ انہی کے ہاتھوں دین کا نظام بھی قائم ہوگا اور یہی روٹی کے مسئلہ کا صحیح حل بھی پیش کر سکیں گے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے 1932ء کے خطبہء صدارت میں کہا تھا کہ مسولینی نے کہا ہے کہ جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں نے (یعنی علامہ اقبالؒ نے) کہا کہ ''یوں نہیں بلکہ یوں کہ جو خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے''۔ (1) فکر و نظر کی تبدیلی' سیرت و کردار کی پختگی انسان کو فولاد بنا دیتی ہے۔۔ اور یہ وہ فولاد ہے جسے کبھی زنگ نہیں لگتا اور یہی طلوع اسلام کی تحریک کا منتہیٰ ہے۔ والسلام!

پرویز

(مطبوعہ طلوعِ اسلام، نومبر 1970ء)

---

(1) مذکورہ درسگاہ کے لئے پہلا مرحلہ حصول اراضی کا تھا۔ دس سال کی تگ و تاز کے بعد یہ مرحلہ آخری منزل میں پہنچا تو ایک صاحب اقتدار کے دندان آز نے اس کو دبوچ لیا۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی دلخراش ہے لیکن ہم اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے کیونکہ مقدمہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ اگر وہاں سے فیصلہ ہمارے حق میں بھی ہو گیا تو بھی یہ جو اتنا وقت ضائع ہو گیا ہے' اس کی تلافی کون کر سکے گا؟ ہمارے دور کی تاریخ میں یہ سانحہ بہرحال سیاہ حاشیوں کے اندر رقم کیا جائے گا۔ (طلوع اسلام)

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اُسوۂ حسنہ (مسلسل)

21 فروری 2021ء کے ''اسوۂ حسنہ'' پر اپنے خطاب میں، میں نے بتایا تھا کہ یہ اصطلاح جنگِ احزاب کے متعلق قرآنی فرمودات میں پہلی دفعہ سامنے آئی ہے (33:21)۔ اس جنگ میں نبی کریم ﷺ کے کردار کو جماعتِ مؤمنین کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا۔ آپ ﷺ نے قرآنی نظامِ حق قائم کرنے، اسے استحکام عطا کرنے اور باقی رکھنے کے لئے کس قدر تگ و تاز کی اس کا ایک حربی پہلو جو 26 غزوات اور 56 سرایا پر مشتمل ہے، نبی کریم ﷺ کی عسکری بصیرت و تربیت کے پس منظر کے ساتھ سابقہ مضمون میں پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے قرآنی معاشرہ میں نظامِ ربوبیت کے قیام، نظامِ صلوٰۃ و نظامِ عدل، معاشرتی اصلاح اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے جو قابل قدر جدوجہد کی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں انقلابی اقدام کئے، وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔ قرآن کریم نے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو ہر زمان و مکان کے انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ نے زندگی کے ہر شعبہ میں جو کمالات حاصل کئے وہ بحیثیت انسان کے حاصل کئے، اسی لئے آپ کی سیرت ہمارے لئے بہترین نمونہ (Excellent Model) ہے۔ اس مضمون میں نبی کریم ﷺ کو اسی طرح پیش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے جس طرح قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو پیش کیا ہے۔

آپ ﷺ نے قرآنی معاشرہ میں نظامِ ربوبیت کے قیام، نظامِ صلوٰۃ و نظامِ عدل، معاشرتی اصلاح اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے جو قابل قدر جدوجہد کی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں انقلابی اقدام کئے، وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

مختلف شعبۂ ہائے حیات میں نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے ساتھ، اختصار کی غرض سے آپ کے اسمائے گرامی کا تذکرہ مناسب ہوگا جنہیں قرآنِ کریم کے حوالہ جات اور اردو میں ترجمہ کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآنی حوالہ جات کو بالحصر پیش نہیں کیا گیا۔ دو ایک مقامات کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	اسمائے گرامی	قرآنی حوالہ	ترجمہ
1۔	مُحَمَّدٌ	(48:29،47:2،33:40،3:114)	مسلسل وپیہم وجہ محمد وستائش
2۔	اَحْمَدُ	(61:6)	بہت زیادہ حمد وستائش کرنے والا۔
3۔	مَحْمُوْدٌ	(17:79)	سراپا وجہ حمد وستائش۔
4۔	عَبْدُاللّٰہِ (عبدہ)	53:10،17:1،72:19	اللہ کا فرماں بردار
5۔	رَسُوْلٌ	48:29،7:157،9:33،4:79	اللہ کی طرف سے لوگوں کو مسلسل، بتدریج نہایت نرم روی سے پیغام دینے والا
6۔	اَلنَّبِیُّ (نَبِیُّ اللّٰہِ)	66:9،8:64۔65،7:157	علم کے مقامِ بلند پر فائز جہاں نبی (وحی کے ذریعے) حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔
7۔	شَاھِدٌ	48:8،33:45	نگران۔فیصلہ کرنے والا۔
8۔	شَھِیْدٌ	4:41،2:143	سدا نگہبان۔
9۔	مَشْھُوْدٌ	85:3	جس کی گواہی دی گئی۔
10۔	مُبَشِّرٌ	17:105،48:8،33:45	بشارت دینے والا۔
11۔	نَذِیْرٌ	33:45،11:2،7:188	غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے والا۔
12۔	بَشِیْرٌ	33:45،11:2،7:188	خوش خبری دینے والا۔
13۔	داعٍ۔(داعی)	46:31۔32،33:46	اللہ کی طرف بلانے والا۔
14۔	سِرَاجٌ مُّنِیْرٌ	71:16،33:46	روشن چراغ (سورج)۔
15۔	اُمِّیٌّ	62:2،42:7،7:158،7:157	اُمُّ القُریٰ کا رہنے والا۔
16۔	حَرِیْصٌ (عَلَیْکُمْ)	9:128	تم مومنین کی منفعت کی شدید آرزو رکھنے والا۔
17۔	رَؤُفٌ (بِالْمُؤْمِنِیْنَ)	9:128	مومنین کی خوشحالی میں حائل روکاوٹوں کو ہٹانے والا۔
18۔	رَحِیْمٌ (بِالْمُؤْمِنِیْنَ)	9:128	مومنین کو نشوونما فراہم کرنے والا۔

19۔	كَرِيْمٌ	81:19،69:40	باشرف ہستی۔
20۔	هادٍ(هادی)	27:81،30:53،13:7	راہنمائی کر کے منزل مقصود پر پہنچانے والا۔
21۔	اَوْلٰى (بِالْمُؤْمِنِيْنَ)	33:6	زیادہ لائق و مستحق۔
22۔	وَلِيٌّ	5:55	دوست مددگار۔
23۔	مُصَدِّقٌ	2:101،3:81	تصدیق کرنے والا۔
24۔	اَمِيْنٌ	81:21	امانتدار
25۔	مَكِيْنٌ	81:20	عزت و مرتبہ والا۔
26۔	بَشَرٌ	41:6،18:110،17:93	طبعی طور پر انسان۔
27۔	مُنْذِرٌ	79:45،38:65،13:7	خطرات سے آگاہ کرنے والا۔
28۔	مُزَّمِّلٌ	73:1	مناسب رفقائے سفر تیار کرنے والا۔
29۔	مُدَّثِّرٌ	74:1	عالمِ انسانیت کو سنوار کر جہانِ نو پیدا کرنے والا
30۔	مُطَاعٌ	81:21	جس کی اطاعت کی جائے۔
31۔	خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ	33:40	جن کے ذریعے نبیوں کو ختم کیا گیا۔
32۔	مُرْسَلٌ	36:2،2:252	بھیجا ہوا۔
33۔	حَقٌّ	3:86	سچا۔حق۔
34۔	مُبِيْنٌ	43:29	صاف بتانے والا۔
35۔	يَتِيْمٌ	93:6	نابغہ رُوزگار۔جس جیسا دوسرا نہ ہو۔
36۔	مُذَكِّرٌ	88:21	نصیحت سنانے والا۔ یاددہانی کرانے والا۔
37۔	مُطَهَّرٌ	56:79	پاکیزہ۔
38۔	مُنَادٍ(منادی)	3:193	آواز دے کر بلانے والا۔داعی۔
39۔	صَاحِبٌ	53:2	مسلسل ساتھ رہنے والا۔
40۔	رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ	21:107	رحمت سب جہانوں کے لئے۔

نبی کریم ﷺ کے کچھ مشہور اسمائے گرامی وہ ہیں جو قرآنِ کریم میں اس طرح مذکور نہ ہیں۔انہیں قرآنی آیات سے ماخوذ کیا گیا ہے۔یہ درجِ ذیل ہیں۔

نمبر شمار	اسمائے گرامی	قرآنی حوالہ	ترجمہ
1۔	مُصْطَفٰے	22:75	چنا ہوا۔
2۔	مُرتَضٰے	72:27	پسندیدہ۔
3۔	مَنْصُوْرٌ	40:51،37:172	مدد کیا ہوا۔
4۔	اٰمِرٌ	7:157	حکم دینے والا۔
5۔	نَاہٍ	59:7،7:157	روکنے والا۔منع کرنے والا۔
6۔	مَھْدٍ	42:52	ہدایت دینے والا۔
7۔	فَاتِحٌ	110:1،48:1،32:28	رُکاوٹیں دور کر کے آسانیاں کھولنے والا۔
8۔	حَبِیْبٌ	3:76،3:31	پیارا۔
9۔	عَادِلٌ	42:15	عدل وانصاف کرنے والا۔
10۔	مُجْتَبٰی	42:13،3:179	چُنا ہوا۔
11۔	حَامِدٌ	9:112،15:98،27:59	حمد کرنے والا۔
12۔	صَادِقٌ	39:33،33:22	سچا۔صحیح بات کرنے والا۔
13۔	حَکَمٌ	4:65	ثالث فیصلہ کرنے والا۔قانون نافذ کرنے والا۔
14	حَاکِمٌ	5:42-45،4:105	فیصلہ کر کے عمل کروانے والا۔
15۔	مُسَبِّحٌ	87:1،56:74،20:130،15:96،3:41	تسبیح کرنے والا۔پُرزور عمل کرنے والا۔
16۔	مُزَکِّیٌ	62:2،3:164،2:151،9:103	کمی دور کر کے نشوونما دینے والا۔
17۔	مُتَّقِیٌ	33:1	اللہ کے احکام کے مطابق رہنے والا۔خلاف ورزی نہ کرنے والا۔
18۔	مُجَاھِدٌ	66:9،9:73	جہاد کرنے والا۔بھرپور کوشش کرنے والا۔
19۔	مُؤْمِنٌ	7:158	ایمان ویقین رکھنے والا۔
20۔	مَبْعُوْثٌ	62:2،3:164	بھیجا ہوا۔جذبہ سے اٹھا کھڑا کیا ہوا۔
21۔	مُبَلِّغٌ	5:67	پیغام پہنچانے والا۔
22۔	مُعَلِّمٌ	62:2،3:164،2:151،2:129	سکھانے والا۔

23۔	صَائِمٌ	2:185	روزہ دار۔
24۔	مُقِيْمُ الصَّلٰوةِ	17:78،4:102	صلوٰۃ کو قائم کرنے والا۔
25۔	قَائِمٌ بِاللَّيْلِ	73:1،20	رات میں قیام کرنے والا۔
26۔	قَارِئُ الْقُرْاٰنِ	75:18،17:45،106،16:98	قرآن کریم کا پڑھنے والا۔
27۔	مُتَّبِعُ الْوَحْيِ	10:15،109،7:203،6:50	اللہ کی وحی کا اتباع کرنے والا۔
28۔	مَعْصُوْمٌ مِنَ النَّاسِ	5:67	لوگوں کے شر سے محفوظ۔
29۔	مُحَدِّثٌ بِنِعْمَةِ	92:11	اپنے رب کی نعمت کا چرچا کرنے والا۔
30۔	سَاجِدٌ	97:19	سجدہ کرنے والا۔

رسول اللہ کے 99 نود نہ ناموں کی ایک فہرست مروج چلی آتی ہے اور آج کل چھپنے والے قرآنی نسخوں کی جلد کے اندرونی صفحات پر بڑے خوبصورت انداز میں درج ہوتی ہے لیکن ان کے ساتھ قرآنی حوالہ جات درج نہیں ہوتے۔ خصوصاً تاج کمپنی لمٹیڈ۔ کراچی کی ایک فہرست میں 99 ناموں کے بجائے 102 ناموں کا تذکرہ ہے۔ ان میں چار قرآنی حروف مقطعات طٰهٰ، طٰسٓ، حٰمٓ، یٰسٓ کو بطور اسمائے گرامی شامل کیا گیا ہے جبکہ کچھ علمائے تحقیق کا کہنا ہے کہ پورے 14 حروف مقطعات نبی کریم ﷺ کے القابات ہیں کیونکہ ان کے بعد آپ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے لیکن اکثریت کا اس پر اتفاق نہیں۔ نُودنُہ 99 ناموں میں کئی آپ کے خاندانی اور علاقائی تعلق پر مشہور ہیں۔ یہ آپ کا خصوصی شرف ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کے حوالہ نہیں دیا۔

مسلم کون ہے؟

ایک ترکھان کے گھر پیدا ہونے والا بچہ پیدائشی ترکھان نہیں ہوتا، اسے یہ ہنر سیکھنا پڑتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا بیٹا بھی اس وقت تک ڈاکٹر نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ بیٹا میڈیکل کالج میں پانچ سال بلکہ اب سات سال تک اس فن کی تربیت نہ حاصل کرلے۔ پھر ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہونے والا بچہ مسلمان کیونکر بن سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلم پیدا نہیں ہوتا، اسے مسلم بننا پڑتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کو بھوک لگے تو آپ گھر بیٹھے رہیں اور آپ کو مختلف قسم کے کھانے مل جائیں۔ گھر بیٹھے آپ انجینئر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا ایک باعمل مسلمان بننے کے لئے ''اللہ کی ہدایت'' کے مطابق زندگی بسر کرنی ہوگی اور ''اللہ کی ہدایت'' آخری آسمانی کتاب قرآنِ مجید میں ہے۔ اس پر عمل کریں اور مسلمان بن جائیں!

(خالد فاروقی)

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

نبیلہ حارث، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''بچّوں کی تربیت'': کیا واقعی بچّے تو پل ہی جاتے ہیں؟

پہلا حصّہ: چند غلط مفروضے اور روایتی طریقے

کمال ہے، جاب چھوڑ دی؟ ایسا بھی کیا، بچّے تو پل ہی جاتے ہیں!

میں جواب میں صرف مسکرا دی۔ جن صاحب نے یہ الفاظ کہے، وہ یقیناً میرے نظریات کے بالکل برعکس، دوسرے کنارے پر کھڑے تھے لہٰذا میں نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بعد میں انہوں نے اپنی کہی ہوئی بات پر معذرت بھی کی لیکن میں ایسے خیالات کے پیچھے موجود سوچ کو سمجھ سکتی ہوں اور میں نے ہرگز برا نہیں منایا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ جملہ ہمیشہ ہی بہت دلچسپ لگتا ہے جب بھی کوئی کہتا ہے کہ ''بچّے تو پل ہی جاتے ہیں۔

اگر ہم اپنے گردونواح پر نظر دوڑائیں تو بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ جسمانی طور پر بالغ ہونے کے باوجود ہم میں سے بیشتر افراد جذباتی اور نفسیاتی سطح پر بچّے ہی ہیں۔ نتیجہ اس کا وہی معاشرتی اور نفسیاتی بحران ہے جو ہم سب کو بحیثیتِ مجموعی گھیرے ہوئے ہے، نتیجہ اس کا ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے افراد انسانی رشتوں کی اہمیت کو سمجھنے اور انھیں میانہ روی کے ساتھ نبھانے سے قاصر ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم بالغ عمر کو پہنچنے کے باوجود نفسیاتی اور جذباتی بلوغت کو نہیں پہنچ سکے جبکہ ہم میں سے بیش تر کی پرورش محبّت کرنے والے ماں باپ نے کی؟ اگر بچوں کی پرورش اور تربیت ہی انسان کو نفسیاتی اور جذباتی پختگی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے تو آج دُنیا کے اور اپنے معاشرے کے حالات دیکھ کر قدرتی طور پر سوال اُٹھتا ہے کہ ایسا کیا غلط ہو گیا اور کہاں؟

اگر ہم اپنے گردونواح پر نظر دوڑائیں تو بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ جسمانی طور پر بالغ ہونے کے باوجود ہم میں سے بیشتر افراد جذباتی اور نفسیاتی سطح پر بچّے ہی ہیں۔

معاشرہ مختلف گھرانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ہر گھرانہ وہ اکائی ہے جو مل کر ایک معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ ایک گھرانے کی زندگی وہ حقیقت ہے جو معاشرے کی عمومی حالت کی عکاسی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے عائلی زندگی کو بہت اہمیت دی ہے:

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً ؕ (30:21)

اللہ نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کر دیئے ہیں (عورت کے لئے مرد اور مرد کے لئے عورت)۔ جوڑا بنانے سے مقصد یہ ہے کہ تمہیں اِن سے آرام اور سکون ملے۔ اِس کے لئے اُس نے تم دونوں میں محبّت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔

اس کی صحیح بنیاد رکھنے کے لئے میاں بیوی کے انتخاب کا معیار ذہنی ہم آہنگی ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر میاں بیوی کا مضبوط رشتہ استوار ہوتا ہے اور اس مضبوط رشتے کی بدولت وہ گھر سکون اور محبّت و احترام کا گہوارہ بنتا ہے اور گھر کے افراد ایک دوسرے کے لئے، قرآنِ کریم کے الفاظ میں، آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بنتے ہیں:

> اگر ہم مستقبل میں ایک بہتر معاشرے اور بہتر دُنیا کی خواہش رکھتے ہیں تو یقیناً ہمیں اپنے روایتی طریقوں کو بدلنا ہوگا۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ (25:74)

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں (میاں بیوی کو) اور ہماری اولاد کو ایسا بنا دے کہ یہ سب ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں۔''

اس کے برعکس، غلط بنیادوں پر اُٹھنے والے رشتے میاں بیوی کے تعلقات میں مضبوطی لانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جس قسم کا میاں بیوی کے درمیان رشتہ ہوگا، اسی قسم کا اس گھر کا ماحول ہوگا۔ جو بچّے اس گھر میں پرورش پائیں گے، ان کے لئے وہ ماحول ہی "نارمل" قرار پائے گا اور ان بچّوں کی آئندہ زندگی میں یہی نارمل ایک انتہائی اہم کردار ادا کرے گا۔ ایک گھرانے کا ماحول اور اس میں رہنے والے افراد کے آپس کے تعلقات اور بچّوں سے برتاؤ ہی یہ تعین کرتے ہیں کہ کل یہ بچّے معاشرے میں کس قسم کا کردار ادا کریں گے۔ گھر کا ماحول کیسا بھی ہو اور چاہے بچّہ اس ماحول میں ہونے والی غلط باتوں کو ناپسند ہی کیوں نہ کرے، اس کے لئے بڑے ہو کر ان تجربات کے اثرات سے نکلنا آسانی سے ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا انتہائی ضروری ہے کہ ہم والدین اپنی ذمہ داری اور بچّوں کی تربیت میں اپنے کردار کی نزاکت کو سمجھیں اور رک کر سوچیں کہ ہم کس سمت میں اپنے بچوں کو لے جا رہے ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچّوں کی تربیت سے مراد ایسا طریقۂ کار یا حکمتِ عملی اختیار کرنا ہے، جس سے بچّوں کو "ڈسپلن" کیا جا سکے، یعنی اُن کے ظاہری رویّوں اور حرکات کو والدین کی مرضی کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ اور جس کے ذریعے شور و غل، ہلچل اور پھیلاوا کم سے کم ہو اور والدین کے کام اور سکون میں خلل نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے ہم وہی طریقے استعمال کرتے ہیں جو ہم نے اپنے والدین کو کرتے دیکھا ہوتا ہے اور جو نسل در نسل روایات کی طرح چلے آ رہے ہیں۔ اور ہم سب جانتے ہی ہیں کہ روایات کو نہ صرف بدلنا بلکہ اُن پر محض سوال اُٹھانا ہی کتنا مشکل کام ہے۔ بہرحال، آج جو شخص بھی دُنیا کی یا اپنے اِردگرد معاشرے کی موجودہ حالت سے پریشان ہے، وہ اس بات کا ادراک کر سکتا ہے کہ ان تمام ناہمواریوں کی ایک بہت بڑی وجہ اس بات پر منحصر ہے کہ بچّوں کی پرورش اور تربیت کن خطوط پر کی گئی تھی۔ اور اگر ہم مستقبل میں ایک بہتر معاشرے اور بہتر دُنیا کی خواہش رکھتے ہیں تو یقیناً ہمیں اپنے روایتی طریقوں کو

بدلنا ہوگا۔ تبھی ہم مختلف اور بہتر نتائج حاصل کرنے کی اُمید کر سکتے ہیں۔

یہاں ایک اہم بات کی طرف توجّہ دلانا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ والدین اپنے بچّوں سے پیار بھی کرتے ہیں، ہمیشہ اُن کا بھلا ہی چاہتے ہیں اور اُنہیں اپنے سے بہتر اِنسان بھی بنانا چاہتے ہیں۔ آگے جو باتیں آ رہی ہیں، اُن سے یوں محسوس ہوگا جیسے سارا کا سارا اختیار اور مرضی بچّوں کو دی جا رہی ہے اور والدین صرف بے بسی سے دیکھیں گے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوں گی جن سے والدین کے جذبات کو ٹھیس بھی پہنچ سکتی ہے اور کچھ شرمندگی کا بھی اِمکان ہے جو کہ ہرگز میرا مقصد نہیں ہے۔ ماں باپ بھی اِنسان ہی ہیں اور اُنہیں اِنسانوں کے ہی مقام پر رہنا چاہیے۔ ہم اُن سے ایسی توقعات رکھنے لگتے ہیں کہ وہ ہر حال میں آئیڈیل رویّے کا مظاہرہ کریں گے۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ والدین کے بھی جذبات اور احساسات ہیں، اُنہیں غصّہ بھی آ سکتا ہے، تھکاوٹ ہو سکتی ہے، اُداسی اور رونا بھی آ سکتا ہے، بچّوں کی بات یا حرکت بُری بھی لگ سکتی ہے۔ اور ایسی صورتوں میں کیا کرنا چاہیے، اُس پر ہم آگے میں بات کریں گے۔ پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے طریقے ہیں جو کام نہیں کر رہے اور کیوں؟ ہم کچھ غلط تصورات، جو کہ بچّوں کی تربیت سے متعلق صدیوں سے عام ہیں اور جو غیر شعوری طور پر نقصان کا باعث بن رہے ہیں، ان کو واضح طور پر سامنے لے آئیں۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ کرنا کیا چاہئے اور کیا بدلنے کی ضرورت ہے اور وہ کون سی بنیاد ہے جس پر بچوں کی پرورش اور تربیت کی مضبوط عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

1۔ فرمانبرداری کا سوال:

بچّوں میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے والی خوبی والدین کی اطاعت ہے۔ یہ وہ صفت ہے جسے عام طور پر بہترین تربیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ فرمانبردار بچّوں کے والدین فخر محسوس کرتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اُن پر رشک کرتے ہیں۔ جو بچّے اپنے والدین کا حکم بجالاتے ہیں، اُن کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اُن کی مرضی کے مطابق چلتے ہیں، اُن کے مشوروں کو مانتے ہیں اور اُن کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرتے ہیں، جو کام ماں باپ کو ناپسند ہو، اُس سے رُک جاتے ہیں، ایسے بچّوں کو والدین، دوسرے رشتہ دار اور اساتذہ کی طرف سے خوب سراہا جاتا ہے۔ ہمارے کلچر میں بالغ اور خودمختار ہو کر بھی والدین کی اطاعت کر کے اُنہیں خوش رکھنا ایک بہت بڑی نیکی تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ تصوّر اس قدر گہرائی میں راسخ ہے کہ اس پر سوال اُٹھانا بچّوں کی تربیت کی پوری بنیاد کو ہلا دینے کے مترادف ہے لیکن بہرحال، مشکل سہی، یہ سوال بہت ضروری ہے کیونکہ ذرا سا غور کیا جائے تو یہ تصوّر قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں والدین پر رحم کرنے، اُن سے احترام اور نرمی سے پیش آنے کی تاکید کی ہے لیکن اطاعت صرف اور صرف اللہ کے حکم کی فرض ہے:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ (6:151)

ان سے کہو کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے نشوونما دینے والے نے تم پر کن باتوں کو واجب قرار دیا ہے۔ یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ (یعنی اس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو واجب الاطاعت نہ سمجھو۔ اِطاعت صرف خدا کے قوانین کی کرو)۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ (17:23-24)

''ان سے سخت کلامی نہ کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں۔ بلکہ ان سے ادب اور عزّت کے ساتھ بات چیت کرو اور نہایت ہمدردی سے انہیں اپنے دامنِ پرورش کے نیچے رکھو۔ اور اللہ سے دُعا کرو کہ جس طرح اِنہوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا تھا، تُو ان کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتا رہ۔

> بہت ہی نایاب ہیں ایسے والدین جو بچّے کی غلطی پر دِل سے کہہ سکیں، ''بیٹا! کوئی بات نہیں، غلطی تو کسی سے بھی ہوسکتی ہے!۔''

جو بچّے والدین اور دوسرے ''بڑوں'' کی اطاعت کے ماحول میں بڑے ہوتے ہیں، وہ آگے جا کر ایک طرف تو کمزوروں پر اپنا زور چلاتے ہیں تو دوسری طرف طاقتور پوزیشن والے افراد سے دبے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور دوسرے نتائج میں سرکشی، فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا فقدان، دوسروں کو خوش کرنے کا رجحان، گہرائی میں سوچنے کی صلاحیت میں کمی، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ (ماہرِ نفسیات، سٹینلی ملگرام کا 1960ء کی دہائی میں فرمانبرداری پر کیا گیا تجربہ اس سلسلے میں دیکھا جا سکتا ہے)۔ اِس اطاعت کے نقصانات کی زندہ مثال وہ تمام گھریلو مسائل ہیں جن کی بنیادی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ بالغ ہونے کے باوجود میاں اور بیوی اپنے اپنے والدین کے زیرِ اثر ہوتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ اُنہیں خوش کرنے میں کوشاں رہتے ہیں اور یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ نااِنصافی کہاں ہو رہی ہے اور مسائل کا باعث بن رہی ہے۔

2۔ عزّت واحترام کا معاملہ:

تصوّر کریں کہ آپ کسی محفل میں ہیں کہ اچانک کوئی آپ پر رنگین مشروب گرا دیتا ہے اور انتہائی شرمندہ ہو کر معافی مانگنے لگتا ہے اور ساتھ ہی اُسے صاف کرنے میں آپ کی مدد بھی کرنے لگتا ہے۔ آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ یقیناً ہر مہذّب انسان معافی کو فوراً قبول کر لے گا بلکہ کوشش کرے گا کہ سامنے والا شخص اِس قدر شرمندہ نہ ہو کہ غلطی تو کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ اور اگر کسی بزرگ ہستی سے یہ غلطی سرزد ہو اور وہ معافی مانگنے لگیں تو آپ خود اُن کی جگہ شرمندہ ہو جائیں گے اور چاہیں گے کہ فوراً اُن کو تسلّی دے دی جائے تاکہ وہ مزید معافی نہ مانگیں۔ لیکن اگر یہی غلطی آپ کا اپنا بچّہ کرے تو کیا آپ کا ردِعمل ویسا ہی ہوگا یا بالکل بدل جائے گا؟ محفل ہو یا تنہائی، ہم اپنے بچّوں کو جھڑکنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے بلکہ یہ اِس قدر معمول کا حصّہ ہے کہ وہاں موجود دوسرے رشتہ دار یا بڑے بھی ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کچھ والدین اتنا برداشت رکھتے ہوں کہ محفل میں ٹوکنے سے اجتناب کریں، وہ بھی کم از کم اپنے چہرے کے تاثرات سے

یہ ظاہر ضرور کریں گے کہ بچّے کی "حرکت" سے اُنہیں شرمندگی، افسوس یا مایوسی ہوئی ہے تاکہ بچّہ شرمندہ ہو اور اپنی غلطی کا احساس کرے۔ بہت ہی نایاب ہیں ایسے والدین جو بچّے کی غلطی پر دِل سے کہہ سکیں، ''بیٹا! کوئی بات نہیں، غلطی تو کسی سے بھی ہوسکتی ہے!۔''

ایسا کیوں ہے کہ ہم نے عزّت واحترام کو صرف "بڑوں" کے لئے مختص کر دیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہر اِنسان کو یکساں واجبُ التکریم بنایا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)

ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔

اور ہم بچّوں کو اس تکریم کا مستحق ہی نہیں سمجھتے! عزّت دیتے بھی ہیں تو مشروط، جب وہ ہماری مرضی کے مطابق عمل کریں۔

> ڈرامے باز، روتی شکل، ضدّی، غصیلا، باتونی، شرارتی، سست، کوڑھ مغز، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح بچے کی شخصیت کے بے شُمار رنگوں کو ایک نام میں محدود کر کے ہم نادانستہ طور پر اُنہیں تنگ نظری کا درس دے رہے ہیں اور تنقید کا فن سکھا رہے ہیں۔

احترام کو پامال کرنے کی کچھ شکلیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ڈانٹنے یا تھپڑ لگا دینے جیسی واضح تو نہیں ہوتیں لیکن نقصان ویسا ہی کر جاتی ہیں۔ مثلاً بچّوں کے جذبات واحساسات کو نظر انداز کرنا کہ جیسے وہ ہیں ہی نہیں، چھوٹے بچّوں کو چھیڑنا، اُن کو کھلونا سمجھنا کہ دیکھیں وہ کیسا ردِعمل دیتے ہیں، اُن کا مذاق اُڑانا، اپنی تفریح کے لئے اُنکو ڈرانا دھمکانا، جھوٹ بولنا، دھوکا دینا اور اُن کے جذبات سے کھیلنا۔

3۔ ''بدتمیزی'' کی حقیقت:

بدتمیزی کا لفظ بچّوں کی تربیت کے سلسلے میں عام استعمال ہوتا ہے لیکن اِس کی تعریف کافی مبہم ہے۔ ہر وہ حرکت جو والدین یا دوسرے بڑوں کو ناپسند ہو، یا نامناسب لگے، ''بدتمیزی'' کے زمرے میں آتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ تعریف کافی کمزور ہے کیونکہ ماں باپ تو بچّوں کی بہت سی ایسی حرکتوں سے پریشان ہو جاتے ہیں جو بچپن کا لازمی حصّہ ہوتی ہیں، مثلاً کھیلنا کُودنا، صوفے یا بستر پر چھلانگیں لگانا، شور مچانا، رونا دھونا، کوئی بات ماننے سے انکار کرنا، چیزیں پھیلانا، کھلونے توڑنا، وغیرہ وغیرہ۔ بچّے یہ سب کر کے جان بوجھ کر آپ کو ستانے کی کوشش نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اپنی کسی نہ کسی ضرورت کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بچّوں کی طرح شور مچانے کی ضرورت، اپنے فطری تجسّس کی تسکین کے لئے توڑ پھوڑ کرنے کی ضرورت، اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے نت نئے تجربات کرنے کی ضرورت اور اپنے طوفانی جذبات کے تھمنے میں والدین کی پُرسکون مدد کی ضرورت۔ بچوں کو ان سب "ضروریات" کو پورا کرنے کے لئے والدین کی معاونت درکار ہوتی ہے لیکن اُن کے اظہار کے طریقے اِتنے صاف اور بڑوں کے معیار کے مطابق کچھ خاص مہذّب نہیں

ہوتے۔ بہرحال، بچّوں کو بدتمیز کہنا یا سمجھنا اور یہ سوچنا کہ بچّے آپ کی زندگی مشکل بنانے پر تُلے ہوئے ہیں بچّوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔

4۔ بُرے نام رکھنا/لیبل لگانا:

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط (49:11)

ایک دوسرے کو بُرے القاب سے مت پُکارو۔

بچّوں کے مختلف رویوں اور اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرنے کے لئے ہمارے پاس ''ناموں'' یا ''لیبل'' کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے۔ اُن کا جو رویّہ خاص طور سے ہمیں ناگوار گزرتا ہے یا پریشان کرتا ہے، اُس کو ہم ایک نام دے کر اُس کی پوری شخصیّت کو محض ایک لفظ میں قید کر دیتے ہیں۔ آپ نے سنے ہوں گے یہ نام جیسے ڈرامے باز، روتی شکل، ضدّی، غصیلا، باتونی، شرارتی، سست، کوڑھ مغز، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح بچے کی شخصیت کے بے شُمار رنگوں کو ایک نام میں محدود کر کے ہم نادانستہ طور پر اُنہیں تنگ نظری کا درس دے رہے ہیں اور تنقید کا فن سکھا رہے ہیں۔ لاشعوری طور پر بچّہ دیئے گئے نام/لیبل کے مطابق ڈھلنے لگتا ہے اور ہم اس کی شخصیّت کے کسی ایک پہلو یا عادت کو پختہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

> ہر اِنسان اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے، اُس کا مقابلہ (جارڈن پیٹرسن کے الفاظ میں) صرف اپنے گزرے ہوئے کل سے ہونا چاہیئے، اور کسی سے نہیں۔ اسی طرح اگر آج ہم اپنے بچّے کو دوسرے بچّوں کی مثال دیں گے تو کل وہ بھی یہی دلیل اپنے حق میں استعمال کرے گا۔

5۔ مقابلہ بازی/موازنہ:

اِس میں کوئی شک نہیں کہ موازنہ ہر صورت ایک شخص یا جماعت کو دوسرے سے برتر یا کمتر ثابت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بڑوں کے معاملے میں کافی محتاط رہتے ہیں۔ لیکن ایک بچّہ جیسے ہی پیدا ہوتا ہے، ہم اُس کی شکل وصورت، رنگ روپ اور آگے جا کر اُسکی عادات میں کسی نہ کسی سے موازنہ شروع کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ بڑی بے ضرر سی چیز نظر آتی ہے جسے والدین اور دوسرے رشتہ دار محبت میں ہی کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ اس موازنے میں تنقیدی پہلو بڑھنے لگتا ہے۔ اور اگر نہ بھی بڑھے تو بھی مقابلہ کرنے سے بچّوں میں یہی عادت منتقل ہوتی جاتی ہے اور ایک طرف ہم اُسے بتاتے ہیں کہ وہ دوسروں سے بہتر ہے تو دوسری طرف ہم اُسے احساسِ کمتری دیتے ہیں کہ تم میں کوئی کمی ہے۔ ہر اِنسان اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے، اُس کا مقابلہ (جارڈن پیٹرسن کے الفاظ میں) صرف اپنے گزرے ہوئے کل سے ہونا چاہیئے، اور کسی سے نہیں۔ اسی طرح اگر آج ہم اپنے بچّے کو دوسرے بچّوں کی مثال دیں گے تو کل وہ بھی یہی دلیل اپنے حق میں استعمال کرے گا۔

6۔ سزا، انعام اور تعریف:

سزا اور انعام اور مناسب مقدار میں تعریف بچّوں کو ''ڈسپلن'' کرنے کے لیے ایک انتہائی مؤثر مرکب سمجھا جاتا ہے جو کہ اپنے جادوئی اثر کی بدولت والدین میں کافی مقبول ہے۔ یہ تکنیک واقعی کام کرتی ہے اور فوری کام کرتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے پالتو یا سرکس میں کرتب دکھانے والے جانوروں کو سدھایا جاتا ہے! انسانی بچے کے معاملے میں اس تکنیک کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ یہ کم عرصہ تک کارگر رہتی ہے یعنی صرف اُس وقت تک جب تک بچّہ چھوٹا ہے اور آپ کے زیرِ اثر ہے۔ اس کا اصل نقصان یہ ہے کہ یہ اِنسان کے اختیار و اِرادے کو سلب کر کے طاقت کے ذریعے نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہ اِنسان کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر خوف، ندامت یا لالچ سے اثر انداز ہونے کا ایک طریقہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچّہ کٹھ پتلی بن جاتا ہے اور چند تدبیریں سیکھ لیتا ہے جن کے ذریعے وہ سزا سے بچ سکے یا پھر انعام حاصل کر سکے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی ذمّہ داری لینے سے کتراتا ہے۔

> غیر مشروط محبّت اُس کو یہ اطمینان دیتی ہے کہ اُس کے والدین مشکل میں بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح بچّوں کو گلے لگانا، پیار کرنا اور شفقت سے پیش آنا اُن کی نفسیاتی پختگی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔۔

جہاں تک تعریف کا تعلق ہے، یہ کافی مشکل ہوتا ہے ماں باپ کے لئے تسلیم کرنا کہ یہ نقصان دہ چیز ہے۔ ایک تو یہ کہ عموماً تعریف کے ذریعے بھی ہم بچّے کو کسی خاص سمت میں، جسے ہم صحیح سمجھتے ہیں، موڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بچّے پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور اس کی اپنی ایک سوچ اور مرضی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم بچّے کو تعریف کا عادی بنا دیتے ہیں اور اُس کا خود کو تسلّی دینے کا اندرونی نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے۔

7۔ مشروط محبّت:

کچھ والدین کا خیال ہے کہ بچّوں کو زیادہ پیار کرنے سے وہ بگڑ جاتے ہیں لہذا جب بچّے کوئی ایسی حرکت کریں جو ماں باپ کو بُری لگے تو وہ ناراض ہو کر اپنی محبّت روک لیتے ہیں اور اکثر ایسا کرنے کی دھمکی بھی دیتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ محبّت کے حقیقی معنوں سے غفلت ہے۔ اصل محبّت ہر حال میں عمل میں ڈھلنی چاہیے چاہے جذبے کی شکل میں کسی وقت نہ بھی محسوس ہو۔ مشروط محبّت کا بچّوں کی نفسیاتی صحت پر بہت بُرا اور گہرا اثر پڑتا ہے۔ جب بچّہ کوئی غلطی کرتا ہے یا مشکل جذبات سے گزر رہا ہوتا ہے، اُس وقت اُسے ماں باپ کی محبّت کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہی غیر مشروط محبّت اُس کو یہ اطمینان دیتی ہے کہ اُس کے والدین مشکل میں بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح بچّوں کو گلے لگانا، پیار کرنا اور شفقت سے پیش آنا اُن کی نفسیاتی پختگی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔۔

اس میں ہرگز مضائقہ نہیں کہ ہم اپنے بچّوں کے لیے بہترین کی خواہش کریں اور کوشش کریں کہ وہ مضبوط اور

خودمختار اور اعلیٰ کردار کے حامل انسان بنیں اور معاشرے کے بہترین افراد میں شمار ہوں۔ یہی دُعا ہمیں قرآنِ کریم میں سکھائی گئی ہے:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (46:15)

اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے اس بات کی توفیق عطا فرما کر میں اپنے آپ پر ایسا ضبط اور کنٹرول رکھوں کہ جن نعمتوں سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے، میں انہیں صحیح مصرف میں استعمال کروں۔ اور تیرے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کروں۔ اور میں اپنی اولاد کی صحیح تربیت کر سکوں جس سے وہ بھی صلاحیت بخش کام کر سکنے کے قابل ہو جائے۔ میں ہر معاملہ کے فیصلے کے لئے، تیرے قوانین کی طرف رجوع کرتا ہوں اور جو فیصلہ وہاں سے ملے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

لیکن انہی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اور اپنی ذمّہ داری احسن طریقے سے نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تمام ہتھیاروں کو خیر باد کہہ دیں جو ناکام یا نقصان دہ ثابت ہوتے آئے ہیں اور جو ہماری منشاء اور مقصد کے بالکل برعکس نتائج دے رہے ہیں چاہے وہ کتنے عرصے سے ہی کیوں نہ چلے آ رہے ہوں اور بظاہر کارگر سمجھے جاتے ہوں، اگر قرآنِ کریم کے اُصولوں کے منافی ہیں تو اُنہیں چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

قرآنِ کریم کی تمام تعلیمات ہر انسان پر یکساں لاگو ہوتی ہیں، ہمارے دین میں کوئی دوہرا معیار نہیں ہے۔ اسی ہدایت کی روشنی میں ہمیں اپنے بچّوں کے ساتھ معاملات میں خود اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اور اکثر خود سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ ''اگر بچّہ بھی میرے ساتھ ایسے ہی پیش آئے جیسا میں اُس کے ساتھ پیش آ رہی/ رہا ہوں تو کیسا لگے گا؟'' (جاری ہے)

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بُکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

فرقہ بندی

قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے

''اللہ ورسول'' کے دو الفاظ ہیں لیکن چونکہ قرآنِ کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے (بوجہ اختصار جس کی صرف چار مثالیں پیش خدمت کی جا چکی ہیں) اس لئے اس کے لئے دوسرے مقامات پر ضمیر واحد لا کر بخوبی روشن کر دیا گیا ہے کہ یہ دو اطاعتیں (قرآن وحدیث) نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ایک اطاعت ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ لَکُمۡ لِیُرۡضُوۡکُمۡ ۚ وَاللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗۤ اَحَقُّ اَنۡ یُّرۡضُوۡہُ اِنۡ کَانُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۲﴾ (9:62) یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو ان کو راضی کر لیں۔

یہاں اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ ''یُّرۡضُوۡہُ'' میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ واحد ضمیر لا کر انہیں ایک شمار کرنے سے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ یہ جملہ اللہ اور رسول ﷺ اصطلاح کے طور پر کسی ایک چیز کے لئے لایا گیا ہے۔ جو صرف ایک ہے اور دو نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ''اَغۡنٰىہُمُ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ'' (9:74) انہیں اللہ اور رسول ﷺ نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

> وہ قرآنِ کریم جو انسانیت کو آزاد کرانے کے لئے آیا تھا، اسی سے غلامی اور بُردہ فروشی کے قوانین کی سند حاصل کی گئی ہے۔

یعنی اس واحد مرکزی نظام نے جو حضور ﷺ نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے۔ اس نے انہیں غنی کر دیا۔ فَضۡلِہٖ میں ضمیر واحد لا کر دونوں الفاظ اللہ اور رسول ﷺ کو بطور ایک اصطلاح استعمال کر کے ایک قرار دیا گیا ہے۔

جب تک یہ اطاعتیں ایک رہیں اور اسلام بطور دین کے قائم رہا اور قرآن کریم بطورِ ضابطۂ حیات نافذ رہا اور اس دین کی اطاعت ہی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت شمار کی جاتی رہی، اس وقت تک مسلمانوں میں نہ کسی قسم کا تفرقہ تھا اور نہ ہی کوئی

مذہبی فرقہ راہ پاسکا۔ مذہبی فرقہ کا امکان ہی نہیں تھا کیونکہ اس نظام کی اطاعت سب پر لازم تھی۔ جو اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے حکم جاری ہوا، اس کا اطلاق ایک ایک شہری پر لازم تھا، اور اس کی اطاعت سب پر فرض تھی اور اس کی اطاعت ہی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت تھی۔ لیکن جب نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کی بدقسمتی سے دین کا نظام ختم ہوا اور ان اطاعتوں سے بجائے ایک اطاعت کے دو اطاعتیں شمار کی جانے لگیں تو مسلمانوں میں فرقہ بندی کی ابتداء ہوگئی۔ فرقے مذہب میں ہوتے ہیں دین میں تو فرقہ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جس دن سے اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا غلط مفہوم لینا شروع کیا گیا وہ ہی مسلمانوں کے ادبار کا پہلا سنگ میل تھا۔ سب سے پہلے دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہوئی اور مختلف حضرات اور مختلف گروہوں کے نزدیک اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا مفہوم مختلف ہوگیا اور اسی اختلاف کی وجہ سے فرقے بن گئے اور امتداد زمانہ سے ان میں مزید استحکام پیدا ہوتا چلا گیا۔ چونکہ حکومت کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں رہی اور اللہ اور رسول کی اطاعت انفرادی قرار دی جانے لگی اس لئے اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے مختلف فقہ بنے اور ہر فقہ کے متبعین دوسرے فقہ کے پیروکاروں کو گمراہ سمجھنے لگے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ مسلمانوں میں تفریق، فقہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ایک فقہ کے متبعین کا ایک فرقہ ہے اور دوسرے فقہ کے متبعین دوسرا فرقہ شمار ہوتے ہیں اور فقہ کے اختلاف کی وجہ سے ہی آپس میں اس قدر بغض وعناد ہے۔

> وحی الٰہی کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آئندہ آنے والے دور کا نہ صرف ساتھ دے سکے بلکہ ہر دور میں راہنمائی بھی کرے اور عقل انسانی سے آگے آگے رہے۔ لیکن انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی یہ صورت نہیں ہوتی عقل انسانی اپنے ماحول سے یقیناً متاثر ہوتی ہے اور وہ کسی حال میں بھی اپنے زمانے سے آگے نہیں جاسکتی۔

عقائد کا تعلق دنیا میں عملی زندگی پر براہ راست کم پڑتا ہے جو واقعات تاریخِ اسلام میں گزر چکے، ان کو نہ تو کوئی مٹا سکتا ہے (Un-do) اور نہ ہی ان کا کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ہماری روز کی زندگی میں جس چیز کا اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے اور جس سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے وہ فقہ کا ہی اختلاف ہے۔ وہی ہماری عبادت پر حاوی ہے اور اسی کی بنیاد پر عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں اور انہیں کو عدالتوں میں نظائر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہماری فقہ جس کو ہم سب اس قدر اہمیت اور تقدس دیتے ہیں اس کی اصل صورتحال یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قرآنِ کریم کے خلاف ہے اس پر غور کرنے کے سلسلہ میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

اولاً جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ہماری یہ تمام فقہیں بنوعباس کے دور میں مُدون ہوئی تھیں اور وہ دور بادشاہت، پیشوائیت، جاگیرداری، استحصال اور سرمایہ داری کا دور تھا۔ بادشاہت کی وجہ سے سخت استبدادیت تھی، فکر کی آزادی بالکل مسلوب تھی۔ اقلیتوں، مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور بچوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا، خصوصاً عورتوں کے حقوق کا بالکل

فقدان تھا۔عورتوں کے متعلق زیادہ تر قوانین قرآنِ کریم کے بالکل خلاف بنائے گئے۔ وہ قرآنِ کریم جو انسانیت کو آزاد کرانے کے لئے آیا تھا، اسی سے غلامی اور بُردہ فروشی کے قوانین کی سند حاصل کی گئی ہے۔قرآن کریم نے جتنے ذرائع Exploitation of man by man کے بند کئے تھے، فقہ نے ان سب کو بالکل کھول دیا، قرآن کریم جتنی (Progressive)اور Revolutionary کتاب ہے، اتنا ہی اس کو فقہ کے قوانین میں جکڑ کے Retro-gressive بنادیا۔

ثانیاً قابل غور یہ بات ہے کہ وہ دور بالکل ابتدائی اور سادہ دور تھا۔آج کل کے مشکل اور پیچیدہ مسائل اس زمانہ میں در پیش نہیں تھے۔آج کے پیچیدہ مسائل کا دس فیصد حصہ بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔موجودہ دور کے مسائل کا اس زمانہ میں فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ثانیاً یہ امر قابل لحاظ ہے کہ انسانی عقل اور انسانی معاشرے آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے جارہے ہیں، آج سے ایک ہزار سال پیشتر مغربی ممالک میں بھی جو قوانین بہت سخت خلاف عقل اور جامد تھے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے قوانین کی تشکیل میں عقل وبصیرت سے کام لیا اور آج ان کے قوانین اس ایک ہزار سال پیشتر کے قوانین سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں آج سے ایک ہزار سال قبل انسانی عقل اور انسانی معاشرے اس قابل نہیں تھے کہ وہ ایسے عمدہ اور قابل عمل اور بصیرت پر مبنی قوانین بنا سکیں کہ وہ آج ہمارا ساتھ دے سکیں۔وحی الٰہی کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آئندہ آنے والے دور کا نہ صرف ساتھ دے سکے بلکہ ہر دور میں راہنمائی بھی کرے اور عقل انسانی سے آگے آگے رہے۔لیکن انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی یہ صورت نہیں ہوتی عقل انسانی اپنے ماحول سے یقیناً متاثر ہوتی ہے اور وہ کسی حال میں بھی اپنے زمانے سے آگے نہیں جاسکتی۔ ہمارے فقہائے عظام کے بنائے ہوئے قوانین بھی اپنے مخصوص معاشروں سے متاثر ہوئے اور وہ اپنے دور کے لئے تو خود مکتفی تھے آج کے دور کا وہ ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

> حضور ﷺ نہ صرف سب سے پہلے مسلمان ہوئے بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی حضور ﷺ اوّل المسلمین ہیں۔ان کی مثل اور نظیر کوئی مسلمان نہیں۔ قرآنِ کریم کے واضح حکم کا اتباع کرتے ہوئے حضور ﷺ نے اپنے کو ہمیشہ مسلم ہی قرار دیا۔اس لئے اس سنت سے اہم سنت اور ضروری سنت اور کون سی ہوسکتی ہے؟

رابعاً یہ نکتہ پیش خدمت کرنا ضروری ہے کہ اسلامی حکومت مسلم حکومت میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ ہر مسلم حکومت اسلامی حکومت نہیں ہوتی۔مثلاً آج ہمارے اس دور میں ترکی، مصر، مراکش اور انڈونیشیا وغیرہ کی حکومتیں مسلم حکومتیں ہیں کیونکہ وہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔لیکن یہ حکومتیں اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔اسی طرح بنوعباس کے دور

کی حکومت بے شک مسلم حکومت تھی کیونکہ اس کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن وہ اسلامی حکومت نہیں تھی بلکہ بادشاہت پر مبنی نظام تھا اور بادشاہ کا حکم صحیح شمار ہوتا تھا۔ وہ غیر اسلامی حکومت تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے نافذ کردہ قوانین اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ چونکہ یہ قوانین خود غیر اسلامی حکومت کے مدون کردہ تھے اس لئے وہ کسی طرح بھی اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جاسکتے، لیکن ہم نے انہی قوانین کو اسلامی ٹھہرا کر اپنی فقہ قرار دیا ہوا ہے۔ فقہ اسلامی یا شریعت اسلامی، اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ آج اگر پھر سے اسلامی نظام کہیں متمکن ہوجائے تو اس حکومت کے قوانین ہی فقہ اسلامی اور اسلامی شریعت ہوں گے۔ ہم ان سابقہ غیر اسلامی حکومتوں کے قوانین کا اتباع کرنے کے پابند نہیں ہیں۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ قرآنِ کریم نے ''اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' کے جملہ موجبہ سے صرف قرآن کریم کے اتباع کا حکم فرمایا اور لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ کے سالبہ جملہ سے قرآنِ کریم کے علاوہ ہر مذہب، فرقہ، فقہ، مشرب اور مسلک کے اتباع کی نفی فرمادی۔ لیکن آج صورتحال یہ ہے کہ قرآن کریم محض تبرکاً ہی رہ گیا ہے اور اتباع کے لئے مختلف فقہ اور اپنی اپنی منتخب شخصیتیں مقرر کی گئی ہیں جس کا نتیجہ ہے۔ کہ جو قوم مجابہ روش اختیار کرے گی اس کے لئے عذابِ عظیم ہے۔ واضح رہے کہ مسلمان صرف وحی الٰہی اور ہر اس حکومت کے جس میں بھی قوانین الٰہی جاری ہوں کے اتباع کرنے کے مکلف ہیں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی پابندی ان پر لازم نہیں ہے کیونکہ اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرے اور اس راستے کی اتباع کا جو قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔

ہمارے ہاں اتباع سنت پر بہت اصرار کیا جاتا ہے اور سنت کے مفہوم میں اتنی وسعت رکھی گئی ہے کہ حضور ﷺ کے ذاتی شخصی امور بھی سنت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حضور ﷺ ایک خاص خطہ زمیں اور ایک خاص دور میں تولد ہوئے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ملک کی معاشرت ہی اختیار فرمانی ضروری تھی۔ حضور ﷺ کے وہ معمولات جو حضور کے خورونوش، نشست، و برخاست عام روش زندگی سے متعلق تھے۔ انہیں بھی سنت کی تعریف میں شامل کرکے ان کے اتباع پر اصرار کیا جاتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ حضور ﷺ کی اولین سنت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ حضور ﷺ کی اولین سنت یہ ہے کہ وہ صرف قرآن کا اتباع کرتے تھے وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ (10:109) اے رسول جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو، اسی راستے کے اتباع کو حضور ﷺ نے صراطِ مستقیم کا اتباع قرار دیا ہے۔ (6:157) یہ ہے وہ صراط مستقیم جس پر میں گامزن ہوں تم سب بھی اسی کا اتباع کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کا اتباع ہی اتباعِ سنت رسول اللہ ﷺ ہے اسے

اور کسی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور جو حضرات اتباع سنت پر اصرار کرتے ہیں، انہیں سب سے پہلے حضور ﷺ کی اسی سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کو اوّل المسلمین قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلم ہی کہا ہے اور اس میں تقدم زمانی کے ساتھ ساتھ تقدم کیفی بھی شامل ہے یعنی حضور ﷺ نہ صرف سب سے پہلے مسلمان ہوئے بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی حضور ﷺ اوّل المسلمین ہیں۔ ان کی مثل اور نظیر کوئی مسلمان نہیں۔ قرآنِ کریم کے واضح حکم کا اتباع کرتے ہوئے حضور ﷺ نے اپنے کو ہمیشہ مسلم ہی قرار دیا۔ اس لئے اس سنت سے اہم سنت اور ضروری سنت اور کون سی ہوسکتی ہے؟ لیکن افسوس کہ جو حضرات اور تمام سنتوں جیسے مسواک کرنا، ایک خاص وضع کا لباس پہننا، بیٹھ کر پانی پینا وغیرہ جیسی سنتوں تک کی نگہداشت کرتے ہیں وہ اس سنت پر بالکل عمل نہیں کرتے۔

> ہر مسلمان شہری کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ قرآنِ کریم کی اطاعت اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہے اور اس کے علاوہ کسی اور نام سے اپنے آپ کو موسوم نہ کرے۔

سابقہ صفحات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے جو فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی کتاب سے بالکل نہیں رہتا۔ ان میں سے ہر شق کے بارے میں متعلق آیات ساتھ ساتھ درج کی گئی ہیں۔ مزید یہ تحریر کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی سنت بھی یہ ہے کہ فرقہ بندی سے مجتنب رہا جائے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہا جائے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ دستورِ پاکستان میں ان دونوں باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور فرقہ واریت کو آئینی تحفظ دیا گیا ہے۔ دستورِ پاکستان کے آرٹیکل (1)227 میں درج ہے۔

''تمام موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو۔''

اس شق کے مطابق تمام قوانین کا ماخذ صرف قرآن وسنت کو قرار دیا گیا تھا اور کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف وضع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد صدارتی حکم نمبر 10 مجریہ 18 ستمبر 1980ء میں ان قوانین کے سلسلہ میں مزید ترمیم ان الفاظ میں کر دی گئی۔ ''وضاحت جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں کے کسی فرقہ کے پرسنل لاء (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن وسنت سے مراد اس فرقہ کی اپنی تعبیر ہوگی۔''

دستور کی شق نمبر (1)227 کی اس ترمیم سے فرقہ بندی کو پورا پورا تحفظ مل گیا جس سے عملاً دو دشواریوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ پہلی دشواری یہ ہوگی کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقوں کے لئے شخصی قوانین کی حد تک مختلف قوانین وضع کئے جائیں گے۔ اس طرح ملک میں کئی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ دوسری بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اس طرح پرسنل لاء اور پبلک

لاء میں قوانین تقسیم کر دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفرق بالکل غیر قرآنی ہے۔ یہ تفریق غیر اسلامی حکومت میں ہوتی ہے جہاں پبلک لاء تو سیکولر ہوتے ہیں تو وہاں پرسنل لاء اسلامی جاری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب حکومت ہی اسلامی ہو تو وہاں پبلک اور پرسنل لاء کی تفریق مناسب نہیں۔ اسلامی حکومت میں قوانین حکومت کی طرف سے مدون اور جاری ہوتے ہیں، ان کا اطلاق سب مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن وسنت کو مختلف فرقوں کے معیارات میں جانچنے کی پابندی ختم کر دی جائے۔ کیونکہ جب تک یہ پابندی ختم نہیں ہوگی نہ عدالت کچھ کر سکے گی اور نہ قرآن وسنت کو صحیح مقام حاصل ہوگا۔ لہٰذا ملک میں فرقہ بندی کو مزید تقویت ملنے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قوانین کو وضع کرنے کے لئے عدالت کو صرف قرآن وسنت تک ہی پابند کیا جائے اور اس کے علاوہ ہر اس پابندی سے آزاد کیا جائے جس سے قانون سازی میں مزید دشواریاں بھی پیدا ہوں اور فرقہ بندی کو بھی حاصل ہونے کا خدشہ ہو۔ نیز ہر مسلمان شہری کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ قرآنِ کریم کی اطاعت اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہے اور اس کے علاوہ کسی اور نام سے اپنے آپ کو موسوم نہ کرے۔ اگر حکومت مناسب سمجھے اور عوام تعاون کریں تو حکومت اس کو قانون کی حیثیت سے نافذ کر دے اور اس کی عدم تعمیل کو جرم قرار دے۔

> ہم مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ دیگر غیر مسلم اقوام ہماری اس حالت سے نہ صرف خوش ہیں بلکہ چاہتی ہیں کہ ہم مستقلاً اس حالت میں رہیں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے رہیں۔

آج مسلمان جس مجبور و مقہور حالت میں ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرقہ بندی کی لعنت سے جان چھڑانا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے مسلمان غالب رہنے کے لئے آیا ہے مغلوب رہنے کے لئے نہیں۔ اُمت مسلمہ کو حکم ہے کہ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (16:123) تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔ حضرت ابراہیمؑ کو امام الناس کہا گیا کہ وہ ساری انسانیت کے امام ہیں۔ ان کا مقام ساری انسانیت کے لئے رہبر اور قائد کا مقام ہے اور ہم مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ (2:125) تم مقام ابراہیمؑ کو اپنے لئے مصلیٰ بنا لو یعنی ان کے مقام کے بالکل پیچھے پیچھے چلو چونکہ ابراہیمؑ کا مقام نوع انسانی کی امامت تھی اس لئے تمہارا مقام بھی نوع انسانی کی امامت اور رہبری ہونی چاہئے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کو عام انسانیت کا نگران بنایا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143) اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا جو عالمگیر حیثیت کی مالک ہے۔ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں تم سے برابر فاصلے پر ہوں تمہارے لیے عدل وانصاف کے زاویہ نگاہ سے تمام اقوام یکساں ہوں۔ تمہارا منصب یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال وکردار کے نگراں رہو اور خود

تمہارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا اس نظام کی مرکزی اتھارٹی اور حاکم اعلیٰ ہو۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی، ان سب پر نگراں اور ان کا مرکز رسول اور رسول کے بعد ان کے جانشین ان کے اعمال کے نگراں۔ افسوس صد افسوس اور صد ہزار افسوس کا مقام ہے کہ قرآنِ کریم کے مطابق ملت اسلامی کا دنیا میں کیا مرتبہ اور فریضہ تھا۔ ایک وہ قرآن کریم کی بیان کردہ ملت اسلامی ہے اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہونے کے مدعی ہیں کہ دوسروں کے اعمال کے نگراں ہونا تو بڑی بات ہے ہم خود اقوام عالم میں سب سے زیادہ ذلیل و پست ہیں کیونکہ ہم نے آپس میں فرقہ بندی اور دشمنی اور عناد پیدا کیا ہوا ہے۔

جن قوموں کے پاس وحی الٰہی کی روشنی نہیں وہ کسی بھی قدر کے پابند نہیں۔ ان کی کوئی مستقل اقدار (Values) ہی نہیں جس قدر میں فائدہ دیکھا کر لی۔ مگر ہم مسلمانوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے ہمارے پاس وحی ہونے کے سبب سے مستقل اقدار ہیں جن پر عمل کرنے کے ہم پابند ہیں اور وہی ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہیں۔ ان اقدار پر عمل کرنا نہ صرف ہمارے لئے ضروری ہے بلکہ اس بات کی نگرانی کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے کہ عالم انسانیت میں وہ اقدار (انسانی حقوق) نافذ و جاری ہوں قرآنِ کریم نے ان مستقل اقدار کے لئے ایک جامع اصطلاح معروف و منکر کی استعمال کی ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لے کر قرآنِ کریم کی مستقل اقدار سب شامل ہو جاتی ہیں قرآنِ کریم کی مستقل اقدار میں سے ایک قدر تکریم انسانیت ہے۔ مسلمان قوم کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا میں اس بات کی نگرانی کرے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں تکریم انسانیت ہو رہی ہے یا نہیں۔ جان کی قدر و قیمت، محنت کا پورا پورا معاوضہ، عفت، عصمت، زمین کا ساری انسانیت کے لئے برابر کا استحقاق ہر شخص کو اس سے برابر کا فائدہ اٹھانے کا موقع دینا، بنیادی ضروریات کا فراہم ہونا رزق، تعلیم، مکان کا ہر شخص کے لئے مہیا ہونا۔ عدل و انصاف کا مفت اور آسان مہیا ہونا۔ اس قسم کے بے شمار معروف ہیں جن کا نفاذ اسلامی حکومت کرتی ہے اور دیگر اقوام کی نگرانی کرتی ہے کہ ان سب میں یہ معروف جاری ہوں۔ قرآنِ کریم کے مطابق اُمت مسلمہ کا یہ مقام ہے اور عملاً جو ہماری حالت ہے اس کے لئے حالم میرس صورت بین کی مثال ثابت آتی ہے۔

ہم مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ دیگر غیر مسلم اقوام ہماری اس حالت سے نہ صرف خوش ہیں بلکہ چاہتی ہیں کہ ہم مستقلاً اس حالت میں رہیں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے رہیں۔ ہم اس بات کا اندازہ ہی نہیں کرتے کہ غیر مسلم اقوام کو ہمارے سے کتنی عداوت ہے اور کتنی دشمنی ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کی دشمنی کی ایک رمق جو ظاہر ہوئی ہے غیر مناسب نہیں ہوگا اگر اس کا مختصراً تذکرہ اس مضمون کے بالکل آخیر میں کر دیا جائے تاکہ قارئین کرام کو اندازہ ہو کہ غیر مسلم اقوام کو ہم سے کس قدر دشمنی ہے۔

Mr. Samuel P. Huntington ہارورڈ یونیورسٹی میں معروف پروفیسر ہیں ان کا ایک مضمون (The Clash of Civilizations) ایک مشہور رسالہ (Foreign Affairs) کے 1993ء، Summer کے

Issueمیں طبع ہوا ہے۔ اس مضمون نے بہت شہرت پائی۔ ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں، دوسرے مضمون کا موضوع پرکشش ہے اور مضمون بھی علمی اعتبار سے بلند پایا ہے۔ ملخص اس مضمون کا یہ تھا کہ دنیا میں آئندہ جو تصادم ہوگا وہ تہذیب کا ہوگا۔ ایک طرف مسلمان اور کنفوش کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی۔ مضمون پرمغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات اور واقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریئے کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا زیرِنظر مضمون کو اس کی صحت وسقم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس زیرِنظر مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون کے بالکل آخیر میں انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ، لاطینی امریکہ مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دیں۔ مختلف تجاویز کے بعد جو اصل بات انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

To exploit differences and confilcts among confucian and islamic states

کنفوش کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں، آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یعنی کنفوش کے پیروکاروں میں جو اختلاف ہیں ان کو فروغ دینا چاہئے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں بھی جو اختلافات، مناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہ وہ تجاویز ہیں جو پروفیسر صاحب موصوف نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔

مسلمانوں کی عزت وذلت، اقبال، ادبار، عروج وزوال ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے اگر ان کا دین قائم ہے تو یقیناً مسلمانوں کو عروج حاصل ہوگا۔ اگر انہوں نے اپنے دین سے اعراض کیا، اپنے خودساختہ قوانین جاری کئے تو مسلمانوں کو کبھی عروج حاصل نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کے لئے عروج وتمکن حاصل کرنے اور فرقہ بندی کی لعنت کو دور کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان قرآنِ کریم کے نظام کو جاری کریں اور اسلام کو بحیثیت دین کے متمکن کریں۔ مسلمانوں کی قائم کردہ اسلامی حکومت قرآن کریم کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق قانون وضع کرے وہی ان کی فقہ اور وہی ان کی شریعت ہوگی۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین شریعت ہی اس دور کے لئے فقہ اور شریعت ہوتے ہیں۔ سابقہ فقہ اور شریعتوں کی بجائے، ان کا اتباع ہی ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ اس طرح فرقہ بندی وجود میں آہی نہیں سکتی۔

آخر میں تمام مسلمان بھائیوں سے نہایت دل سوزی اور دردمندی سے درخواست ہے کہ خدارا اپنی حالت زار پر رحم کرو۔ اس سے زیادہ زوال شاید ہی کسی اور قوم کے نصیب میں لکھا ہو۔ کیوں اللہ کے غضب اور عذاب کو آوازیں دے دے کر بلاتے ہو۔ اپنی عورتوں، بچوں، آل اولاد کو پیش نظر رکھو۔ اُن پر رحم کھاؤ، آپس کی فرقہ بندی اور دشمنی ترک کریں، قرآنِ کریم کا اتباع کرکے دنیا اور آخرت میں سرخوئی حاصل کرو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوقومی نظریہ پاکستان کی اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:3

اللہ کا عدم سے مُضمِر وجود کی خلق کی ابتداء سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے ہماری دنیا کے اِنتہائی اِنسانی ذات کے مقام تک کا سفر

نظریہ فجائی ارتقاء کا مؤقف:

نظریہ ارتقاء کے مطابق، زندگی کی پیدائش سب سے پہلے اولین جرثومہ حیات (نفس واحدہ) کے ذریعے سے ہوئی۔ یہ اولین جرثومہ حیات جوش نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، جس میں سے، ایک حصہ نر اور دوسرا مادہ تھا۔ یہاں سے زندگی نے پھر مختلف منازل کی طرف سفر شروع کیا۔ اور زندگیاں منزل بہ منزل، رفتہ رفتہ، بتدریج آگے بڑھتی ہوئی چلی گئیں۔ زندگی نے مختلف پیکر اور مختلف شکلیں/ انواع اختیار کیں مثلاً نباتات اور حیوانات کی مختلف اقسام کی ہر نوع نے، اپنے اپنے مختلف ادوار میں ایک کڑی سے دوسری اور اسی طرح اگلی کڑیوں کی شکل اور پیکر اختیار کرتی گئیں۔ اِس کے بعد زندگی تدریجی ارتقاء سے پیکرِ انسانی میں نمودار ہوئی۔ سائنسدان اپنی تحقیق میں، ہر کڑی کے متعلق بتاتے ہیں کہ پچھلی کڑی کی کون کون سی چیزیں بتدریج آگے بڑھ کر، اس نوع کے اندر آئیں، اور یہ کڑی پھر آگے کیسے چلی۔ یہ ہے زندگیوں کا تدریجی ارتقاء ہے جو مسلسل ایک کڑی سے، دوسری کڑی، اور اسی طرح آگے کڑیاں طے کئے جا رہا ہے۔

> جس بنیادی غلطی نے ارسطو سے لے کر آج تک فلسفہ فطرت کو مکدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے نباتی احساس، حیوانی جبلت اور انسانی شعور کو ایک ہی میلان کے تین درجے تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عمل کی تین مختلف شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے یکسر الگ الگ ہیں۔ ان میں باہمی فرق نہ تو درجات کا ہے اور نہ ہی شدت کا۔ ان میں نوعی فرق ہے۔

سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق، تدریجی ارتقاء کے علاوہ ایک دوسرا ارتقاء بھی ہے جو یکلخت یعنی بتدریج کڑیوں سے گزرے بغیر ہوتا ہے، اِسے انہوں نے فجائی ارتقاء کا نام دیا ہے۔ زندگیوں کی تحقیق میں، یہ بات ان کے سامنے آئی کہ فلاں

ارتقاء تو پچھلے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہاں آ کر سائنسدان حیران ہو جاتے ہیں کہ تدریجی ارتقاء کے بغیر یہ تغیر کیسے ممکن ہوا۔ ایسے مقامات پر انہیں ایسی تبدیلیاں ملتی ہیں، جو زندگیوں کو یکلخت، ہنگامی طور پر ملی ہوتی ہیں۔ اِس موقعہ پر سائنسدانوں نے ارتقا کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک تو وہی تدریجی ارتقاء، جو زندگی کی پچھلی کڑی کا نتیجہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو پچھلی کڑیوں یا کڑی کے بغیر یکلخت نمودار ہوا۔ اس دوسرے ارتقاء کو انہوں نے فجائی ارتقاء کا نام دیا، جو ہنگامی طور پر، بغیر کسی سابقہ کڑی کے نتیجہ کے، نمودار ہوتا ہے۔ اس طرح 1901ء میں Hugo Marie de Vries نے تبدیلی کا نظریہ (MUTATION THEORY) پیش کیا۔ جس کے مطابق: ''ایک موجود میں اچانک نئی صفات پیدا ہو جاتی ہیں، جن کے ذریعے ایک موجود اپنی حیات کو باقی رکھ سکتا ہے اور جب اس اچانک تبدیلی کے بہت سے تحرکات موافقت میں جمع ہو جائیں تو پھر اس سے جانداروں کی نوع میں بھی تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے''

> یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ یہ ارتقائی عمل ذہن پر آ کر رک جائے گا۔ ذہن سے آگے بھی ایک صفت کا نقش ملتا ہے، جس کا ذہن سے وہی تعلق ہے جو ذہن کا حیات سے اور حیات کا مادے سے ہے۔

اب تک کی انسانی تحقیق کے مطابق نظریہ ارتقاء کی یہ دو اقسام سامنے آئی ہیں

1۔ ڈارون کے دریافت شدہ حقائق کے مطابق تدریجی ارتقاء جس کے کے مراحل علت و معلول کی کڑیاں عبور کرتے ہوئے سلسلہ وار آگے بڑھتے ہیں۔

2۔ پروفیسر مارگن کے دریافت شدہ حقائق کے مطابق فجائی نظریہ ارتقاء، جس کی رو سے بعض اوقات ایک نوع علت و معلول کی یکلخت کئی کڑیاں پھاند کر دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر مارگن لکھتا ہے کہ

''اگر یہ پوچھا جائے کہ تم جس چیز کو فجائی کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اس قدر ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہے کہ ان نئے قسم کے رابطوں کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی کچھ نہیں بتایا جا سکتا ہے۔''

اس حقیقت کی وضاحت برگسان نے یوں کی ہے کہ جس بنیادی غلطی نے ارسطو سے لے کر آج تک فلسفہ فطرت کو مکدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے نباتی احساس، حیوانی جبلت اور انسانی شعور کو ایک ہی میلان کے تین درجے تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عمل کی تین مختلف شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے یکسر الگ الگ ہیں۔ ان میں باہمی فرق نہ تو درجات کا ہے اور نہ ہی شدت کا۔ ان میں نوعی فرق ہے۔

اس نوعی فرق کی بحث سے یہ نتیجہ اخذ بھی کیا گیا ہے کہ حیوانی شعور صرف حسّیاتی علم کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب کہ انسانی

شعور، تصوراتی علم کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ چیز حیوانی شعور کے ارتقاء سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ کوئی اور ہی نئی چیز ہے۔

میکانکی تصورِ حیات نے کہا تھا کہ کائنات میں مادہ میں تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ جدید تخلیق نہیں ہوتی عصرِ حاضر کی تحقیق سے البتہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فجائی سلسلہ ارتقاء کے ساتھ جدید تخلیق کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

''سلسلہ ارتقاء کے باب میں اب یہ حقیقت بھی سامنے آرہی ہے کہ ارتقاء کے معنی یہ نہیں کہ اب تخلیق جدید نہیں ہو رہی۔ فجائی ارتقاء درحقیقت تخلیق جدید ہی ہے۔ اس انکشاف سے نظریہِ ارتقاء میں ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کی جارہی ہے۔''

پروفیسر الیگزنڈر فجائی ارتقاء یا ارتقائے بروزی کی ترجمانی میں کہتا ہے کہ جامد مادہ، حرکی مادہ اور ذہنِ انسانی بتدریج ارتقاء پذیر نہیں ہوتے ہیں۔ اس نشوونما کا تصور وہی ہے جو لائڈ مارگن نے پیش کیا ہے اور اسے بروز (فجائی) کا نام دیا ہے۔ حیات کا بروز یعنی نمو مادے سے ہوا ہے۔ ایک زندہ شے مادی شے ہے البتہ اس میں ایک نئی صفت کا ظہور ہوتا ہے جسے حیات کہتے ہیں۔ یہی بات ہم اُس عمل سے متعلق کہہ سکتے ہیں جو حیات سے ذہن کی جانب ہوتا ہے۔

> انسانی پیکر بہت سے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد ہی اپنی ذات کی شناخت میں پہنچا ہے، لیکن انسانی ذات، انسان کے طبیعی جسم کے ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ براہ راست اللہ کی طرف سے، ہر انسانی بچے کو ودیعت کی جاتی ہے۔ یہ اِس لئے کہ نشوونما یافتہ ذات' انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہوتی' بلکہ حیات بعد الممات میں بدستور مزید ارتقاء کے لئے زندہ رہتی ہے۔

ایک ''باذہن شخص'' زندہ بھی ہوتا ہے لیکن اس کے ارتقاء میں پیچیدگی ہوتی ہے. اس کے اجزاء ترکیبی بالخصوص اس کے نظام عصبی میں ربط ونظم اس قدر نازک اور دقیق ہوتا ہے کہ اس سے ذہن یا شعور کی نمود ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

''یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ یہ ارتقائی عمل ذہن پر آکر رک جائے گا۔ ذہن سے آگے بھی ایک صفت کا نقش ملتا ہے، جس کا ذہن سے وہی تعلق ہے جو ذہن کا حیات سے اور حیات کا مادے سے ہے۔ الیگزنڈر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس صفت کو میں یزدانیت کہتا ہوں اور جس شے میں یہ پائی جاتی ہے وہ خدا ہے''۔

یہاں خدا سے الیگزانڈر عملِ ارتقاء کے دوران ظہور بارزہ کا اگلا مرحلہ مراد لیتے ہوئے وہ مزید وضاحت کرتا ہے کہ

''کائنات کی جو سطح بھی ہو خدا اس سے بلند ہوتا ہے۔ مثلاً جب کائنات جمادات کی سطح پر تھی تو خدا نباتاتی سطح پر تھا۔ جب کائنات نباتاتی سطح پر آگئی تو خدا حیوان کی سطح پر تھا۔ جب کائنات حیوان کی سطح پر آگئی تو خدا انسان (یعنی شعور) کی سطح پر تھا۔ اب کائنات شعور کی سطح پر ہے تو خدا ملائکہ کی سطح پر ہے۔ اس طرح کائنات کی سطح اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ بلند سطح اس کے نزدیک اِلہ پرستی کہلاتی ہے''۔

ہماری اپنی دنیا میں جب سائنسدان ہر نوع کی فجائی ارتقاء کے نتیجہ میں ایک علیحدہ مخلوق کی تبدیلی میں علّت ومعلول

کی کڑیاں ملاتے ہوئے پیچھے کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں عِلت ومعلول کی کڑیاں نظر آ رہی ہوتی ہیں کہ یہ چیز یوں بنی، پھر وہ چیز یوں بنی اور اسی طرح جب آخر میں پہنچتے ہیں، تو حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں کہ یہ اوّل مرتبہ کیسے بنا؟۔ وہاں کوئی کڑی نظر نہیں آتی، جس سے دوسری کو وابستہ کرنے کا خیال بھی پیدا ہو۔ یہ ابتدائی فجائی ارتقاء میں خلق ہونے کا مؤقف وضاحت طلب ہے۔

15۔نظریہِ فجائی ارتقاء میں ابتدائی ارتقاء کا مؤقف

فجائی ارتقاء کے چار مرحلے بتائے جاتے ہیں۔

1۔پہلی نوع میں کائنات کی ابتدا کی مادی حالت جمادات کی صورت میں آتی ہے۔

2۔دوسری نوع میں نباتات کی صورت ہوتی ہے۔

3۔تیسری نوع میں ازخود حرکت کے حامل زندہ حیوان کے ظہور اور طبیعی نسلِ انسانی کے ظہور کی صورت میں آتی ہے۔

4۔انسان کے ظہور سے لے کر انسان کی نفسیاتی تکمیل تک ذات کے موجودہ مرحلہ میں جو اِس وقت تک بھی جاری ہے۔

> اکتسابی علم چاہے کسی بھی شعبہ سے متعلق ہو، وہ بہرحال تدریجی ارتقاء کے اصول بیان کرنے میں محدود رہے گا۔ اِس کے مقابل میں دوسرے فجائی ارتقاء کے لامحدود کا انکشاف عِلمُ الوحی سے کیا جاتا ہے، جو تدریجی اکتساب کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اس میں بغیر کسی قسم کے اکتساب کے، خارج سے یکلخت حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔حقیقت اپنے آپ کو، خود نبی پر منکشف کرتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ نظریہِ ارتقاء کی دریافت کا اِنکشاف سے معلوم ہوا کہ ان انواع کے اندر رہتے ہوئے تدریجی ارتقاء کے مراحل ہونا ممکنِ العمل ہوتے ہیں۔ وہ علت ومعلول کی کڑیاں عبور کرتے ہوئے تدریجی طریقہ سے سلسلہ وار آگے بڑھتے ہیں، جس میں نوع کی تبدیلی بھی شامل ہوتی ہیں۔

اِس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ فجائی نظریہِ ارتقاء کی رو سے علت ومعلول کی یکلخت کئی کڑیاں پھاند پہلی نوع سے دوسری، پھر دوسری سے تیسری اور پھر تیسری سے چوتھی نوع میں تدریجی ارتقاء سے تبدیلی ہوتی ہے۔

کائنات کی ابتدائی تخلیق مین یہ بات ان کے سامنے آئی کہ یہ ارتقاء تو پچھلے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہوسکتیں کیونکہ یہ تو عدم سے وجود کا ارتقاء ہوا ہے اور یہاں آ کر سائنسدان حیران ہو جاتے ہیں کہ تدریجی ارتقاء سے ہوئی کڑیوں کی غیر موجودگی میں یہ تغیر کیسے ممکن ہوا۔ یہاں سائنسدانوں نے ارتقا کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔

1۔ایک تو وہی تدریجی ارتقاء، جو زندگی کی پچھلی کڑی کا نتیجہ ہوتا ہے اور

2۔دوسرا وہ جو پچھلی کڑیوں یا کڑی کے بغیر یکلخت نمودار ہوا۔

پہلا تدریجی ارتقاء کا ابھی ہم مطالعہ کر چکے ہیں اور دوسرے ارتقاء کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جو ہنگامی طور پر، بغیر کسی سابقہ کڑی کے نتیجہ کے، نمودار ہوتا ہے۔ یہ عدم سے وجود کا مرحلہ کا فیصلہ اللہ کے عالمِ امر/مشیت میں طے ہوتا ہے۔ خدا کا امر/مشیت کا مرحلہ کیا ہوتا ہے اور کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ قرآن میں ہے کہ

وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ (2:117)

''اور جب وہ ایک کام کا حکم کرتا ہے تو اُسے کہہ دیتا ہے ہوسو وہ ہو جاتا ہے''۔

''کُن'' کے بعد خدا کا ارادہ یکون کا مرحلہ شے کے بہت پست ترین نقطے میں ڈھل جاتا ہے اور شے عالم خلق میں منتقل ہو جاتی ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی جواب نہیں دے سکتا کہ:

ا۔ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے اور

ب۔ اب اِس وجود کے ختم ہو جانے کے بعد مزید ارتقاء کے لئے دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے۔

اُن کی اپنے مقام پر وضاحت کی گئی ہے۔ یہاں عِلم کے میدان کا موضوع ابھی تک زیرِ بحث نہیں آیا لیکن انسان کا اکتسابی علم چاہے کسی بھی شعبہ سے متعلق ہو، وہ بہر حال تدریجی ارتقاء کے اصول بیان کرنے میں محدود رہے گا۔ اِس کے مقابل میں دوسرے فجائی ارتقاء کے لامحدود کا انکشاف عِلمُ الوحی سے کیا جاتا ہے، جو تدریجی اکتساب کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اس میں بغیر کسی قسم کے اکتساب کے، خارج سے یکلخت حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ حقیقت اپنے آپ کو، خود نبی پر منکشف کرتی ہے، نبی حقائق کا انکشاف نہیں کرتا۔ سائنس کے جتنے انکشافات ہیں، اس میں انسان حقائق پر پڑے پردوں کو ہٹاتا ہے، تو حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ حقیقت پہلے سے موجود ہوتی ہے، جو پردوں میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ وحی کے معاملے میں یہ چیز نہیں ہے کہ نبی خود پردہ اٹھا دے، اور حقیقت سامنے آجائے، نبی کا حقیقت کو سامنے لانے میں کوئی دخل ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود بے نقاب کر کے، وحی کے ذریعے نبی کے سامنے لائی جاتی ہے۔ یکلخت حقائق کے انکشاف کو آج کی اصطلاح میں فجائی، ہنگامی ارتقاء کا بھج نام دیا جا سکتا ہے۔ اِس کی وضاحت کے لئے ہم نے اگے ایک علیحدہ باب مختص کیا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسانی پیکر بہت سے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد ہی اپنی ذات کی شناخت میں پہنچا ہے، لیکن انسانی ذات، انسان کے طبیعی جسم کے ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ براہ راست اللہ کی طرف سے، ہر انسانی بچے کو ودیعت کی جاتی ہے۔ یہ اِس لئے کہ نشوونما یافتہ ذات' انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہوتی' بلکہ حیات بعد الممات میں بدستور مزید ارتقاء کے لئے زندہ رہتی ہے۔ اِنسانی ذات کے لئے آخرت میں حیات بعد الممات پر ایمان ہونا لازم ہوتا ہے۔

اِنسانی ذات کا دنیاوی زندگی کے آخری ارتقاء کے بعد حیات بعد الممات میں پہلے ارتقاء کا امکان:

آخرت کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ جو کسی پہلے آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آ رہی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''آخر'' ایک سلسلہِ ارتقاء کی آخری کڑی ہوتا ہے۔ انسانی پیکر میں آ کر زندگی نے اپنی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف شکل اختیار کر لی۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (23:14)

پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی تخلیق میں کھڑا کیا۔

اب طبیعی جسم میں نہیں، بلکہ ارتقاء انسانی زندگی یعنی ذات میں ہوگی اِس کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جو اگرچہ اس زندگی سے بالکل متصل ہوگی، لیکن اس سے موجودہ کڑیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد زندگی ایک نیا اسلوب اختیار کرے گی یعنی وہ زندگی۔ اس موجودہ زندگی کے تسلسل میں موت کے بعد آئے گی قرآن کی رو سے زندگی کا سلسلہ اس سانس کے ساتھ ہی وابستہ نہیں کہ یہ منقطع ہوا، تو زندگی ختم ہوئی۔ زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔ لہٰذا موجود طبیعی زندگی کی کڑیوں کا خاتمہ ہو کر ایک نئے انداز کی زندگی کا آغاز ہوگا۔ اس اعتبار سے وہ ایک نئی زندگی کی پہلی کڑی ہو گی۔ اِنسانی ذات کا دنیاوی زندگی کے آخری ارتقاء کے بعد حیات بعد الممات میں پہلے ارتقاء کا امکان کے متعلق قرآن میں ہے کہ:

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (17:49)

پھر ان کی بعثت ہوگی نئی مخلوق کے طور پر۔

قانون مکافاتِ عمل کی رو سے جو نتائج مرتب ہونے ہیں، وہ اگر اِس زندگی میں مرتب نہیں ہوئے ہیں، تو اس سے آگے مسلسل چلتی حیات بعد الممات میں مرتب ہو جائیں گے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نتائج اس دنیا میں سامنے آئیں یا مرنے کے بعد سامنے آ جائیں۔ انسان کے اعمال کے نتائج خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں، ایک فرد کے ہوں یا ایک قوم کے ہوں، ایک نظام کے، ایک مملکت کے اعمال کے نتائج سبھی یومِ مکافات یا یومِ قیامت پر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ دن اِس زندگی میں اور موت کے بعد بھی آ سکتا ہے۔ جب جسمانی نظام طبیعی قوانین کے تحت موت سے ہمکنار ہوگا، تو نشوونما یافتہ ذات کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ قرآن میں انسانی نفس (ذات) کے متعلق ہے کہ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (91:9-10)

جس نے اس کی نشوونما کر لی، وہ کامیاب و کامران ہو گیا، اور جس نے اسے دبا دیا، وہ نامراد و ناکام رہا۔

Is Sexual Relationship a Private Matter?

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

Dr. Unwin further says that:

"Nogroup of human beings, however, has ever been able, or at any rate has ever consented, to tolerate a state of absolute monogamy for very long. This isnot surprising, for it is an unequal bargain for the women; and in the endthey have always been freed from their legal disadvantages. To expressthe matter in popular language, they have been 'emancipated'."[Page 343]

The nation having the top cultural level

According to Dr. Unwin the nation or tribe that had the best culture was the one which insisted on absolute chastity before marriage and practiced modified monogamy after marriage, i.e., after marriage sexual relationship happened only between the married couple but not forced to remain married for life no matter what; that the marriage could be annulled if the husband or wife are not happy living together. This is what the Quran suggests.

The question is: what is the result of putting these restrictions on sexual relationship? Dr. Unwin has presented evidence from different experts and has derived the following conclusion:

"When a desire is compelled to remainunsatisfied, strong mental tension occurs; the emotional energy is compressed." [Page 313]

This compressed energy finds different outlets for its release. This psychological expression is called "sublimation" according to the famous psychoanalyst Dr. Freud. So, Dr. Unwin says:

"Psychologicalresearches reveal that the placing of a compulsory check upon thesexual impulses, that is, a limitation of sexual opportunity, producesthought, reflection, and energy." [Page 317]

Dr. Feud says:

"This secondthesis, which psycho-analysis puts forward as one of its findings, is an assertion that instinctual impulseswhich can only be described as sexual, both in the narrower and wider sense of the word, play anextremely large and never hitherto appreciated part in the causation of nervous and mental diseases. Itasserts further that these same sexual impulses also make contributions that must not be underestimatedto the highest cultural, artistic and social creations of the human spirit."

[S. Freud, Introductory Lectures on Psychoanalysis, Translated by J. Reverie, Page 17]

Did you see that according to Freud's investigation, if sexual energy is not wasted unabated, then its energy gets directed in building a higher civilization and culture.

Dr. Unwin says that a nation that puts controls on sexual relations then its power of critical thinking and self-analysis is enhanced. On the other hand,when sexual relations are left uncontrolled, Dr. Unwin says about Romans:

"Gradually the old forms of government, outwardly preserved, ceased tofunction. The comitia (in ancient Republican Rome, a legal assembly of the people) lost even the shadow of authority; it was simplyincapable of possessing it. It was the same with the senate. 'There canbe little doubt', Sir Samuel Dill observes, 'that there were men whodreamed of a restored senatorial power. It is equally certain that thesenate was incapable of asserting it.' The extension of sexual opportunityhad done its work. The Romans satisfied their sexual desires ina direct manner. Consequently, they had no energy for anything else."

Lack of energy – Fatigue

I will mention later what the Quran says about satisfying sexual emotion, but at this point I would like to highlight an attribute that it says about Momineen. It says: وَلَا يَزْنُونَ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (25:68) – they do not commit fornication; and the functional capabilities of a community which fails to protect chastity become retarded. Such nations are left behind in their struggle for progress (the same applies to individuals). اَلْاَثِمَةُ (al-athimatu) is used for a female camel that gets tired and hence walks very slowly.اَلْمُوَاثِمُ (al-mowathim) is used to define a camel that can't go any further because of exhaustion. Hence the term اِثْمٌ (ithmun) basically means:Exhaustion,Sadness,Loss of energy,Slow tread,Weakness.

Please note how the Quran has summed up just in one word the realities of what the modern investigation has revealed after extensive research only now: that when sexual emotions are left uncontrolled then the result is that a nation becomes weak and is not able to move forward; that it does not have the energy to take it to higher cultural level.

***

After this Dr. Unwin describes the so-called civilized nations of today. He says that these nations have lifted all the restrictions about sexual relationship. He describes the kind of society that results from this thus:

In a society which has permitted pre-nuptial sexual freedom for at leastthree generations, any young female can indulge in any sexual play of anykind whatever; she can also have intercourse with any young male. Mutualconsent is the sole consideration. Both the female and the male are free from any restraint; they are not troubled by any of those strong emotionswhich arise in the hearts of those whose adolescent impulses have beenchecked. From earliest childhood they indulge in any sexual play thatattracts them; they notice the contempt which their elders express for

theboy or girl who fails to attract the opposite sex; they hear the joking remarkswhich are passed by adult members of the community when a young femalefeels and obeys an urge towards any young male or has any sexual play withhim. They live in an atmosphere of care-free indulgence; and if they feela desire they satisfy it at once.

This is the freedom related sexual emotion that our educated youth want. But what is the result of this? Dr. Unwin puts its thus:

"Sometimes a man has been heard to declarethat he wishes both to enjoy the advantages of high culture and to abolishcompulsory continence. The inherent nature of the human organism,however, seems to be such that these desires are incompatible, even contradictory.The reformer may be likened to the foolish boy who desiresboth to keep his cake and to consume it. Any human society is free to chooseeither to display great energy or to enjoy sexual freedom; the evidence isthat it cannot do both for more than one generation."[Page 412]

Thus to correct this situation he says:

"No society can display productive social energy unless a new generationinherits a social system under which sexual opportunity is reduced to aminimum. If such a system be preserved, a richer and yet richer traditionwill be created, refined by human entropy.There is no need for the whole society to suffer the same continence.So long as the sexual opportunity of one social stratum is maintained at aminimum, the society will display productive energy." [Page 414]

***

The Quranic teaching

Keeping in front the research of Dr. Unwin, let us see what the Quran says on this issue. First of all, please note that the Quran absolutely forbids asceticism and monasticism which teach total abstinence and self-denial and shunning all worldly pleasures. The Quran teaches to benefit from the world and to fulfil instinctual emotions but by being within the limits imposed by it. These limits are imposed by Revelation; therefore, these are eternal and unchangeable. So, these limits are neither imposed by society nor any government can change these limits. The Quran calls it protection of chastity when sexual emotions are fulfilled by remaining within these limits.The Quran puts a great emphasis on chastity. The Quran allows only one way to satisfy sexual emotion; and that is Nikah. Therefore, there is absolutely complete continence before Nikah; and after Nikah no extramarital relationship is allowed by the Quran. The Quran imposes severe punishment for fornication. It is better to understand that Nikah is not something temporary arrangement due to mutual agreement. It is a well thought-out agreement between adult boy and adult girl to spend married life amicably by remaining within the limits imposed by the Quran. Therefore, the question for temporary sexual satisfaction, though it may be by mutual agreement, does not arise at all. The Quran has called Nikah as a well though-out solid agreement: مِّيثَاقًا غَلِيظًا (4:21) – most solemn covenant. It is not child play who builds a house and destroys it and builds another house. The Quran declares

theboy or girl who fails to attract the opposite sex; they hear the joking remarkswhich are passed by adult members of the community when a young femalefeels and obeys an urge towards any young male or has any sexual play withhim. They live in an atmosphere of care-free indulgence; and if they feela desire they satisfy it at once.

This is the freedom related sexual emotion that our educated youth want. But what is the result of this? Dr. Unwin puts its thus:

"Sometimes a man has been heard to declarethat he wishes both to enjoy the advantages of high culture and to abolishcompulsory continence. The inherent nature of the human organism,however, seems to be such that these desires are incompatible, even contradictory.The reformer may be likened to the foolish boy who desiresboth to keep his cake and to consume it. Any human society is free to chooseeither to display great energy or to enjoy sexual freedom; the evidence isthat it cannot do both for more than one generation."[Page 412]

Thus to correct this situation he says:

"No society can display productive social energy unless a new generationinherits a social system under which sexual opportunity is reduced to aminimum. If such a system be preserved, a richer and yet richer traditionwill be created, refined by human entropy.There is no need for the whole society to suffer the same continence.So long as the sexual opportunity of one social stratum is maintained at aminimum, the society will display productive energy." [Page 414]

***

The Quranic teaching

Keeping in front the research of Dr. Unwin, let us see what the Quran says on this issue. First of all, please note that the Quran absolutely forbids asceticism and monasticism which teach total abstinence and self-denial and shunning all worldly pleasures. The Quran teaches to benefit from the world and to fulfil instinctual emotions but by being within the limits imposed by it. These limits are imposed by Revelation; therefore, these are eternal and unchangeable. So, these limits are neither imposed by society nor any government can change these limits. The Quran calls it protection of chastity when sexual emotions are fulfilled by remaining within these limits.The Quran puts a great emphasis on chastity. The Quran allows only one way to satisfy sexual emotion; and that is Nikah. Therefore, there is absolutely complete continence before Nikah; and after Nikah no extramarital relationship is allowed by the Quran. The Quran imposes severe punishment for fornication. It is better to understand that Nikah is not something temporary arrangement due to mutual agreement. It is a well thought-out agreement between adult boy and adult girl to spend married life amicably by remaining within the limits imposed by the Quran. Therefore, the question for temporary sexual satisfaction, though it may be by mutual agreement, does not arise at all. The Quran has called Nikah as a well though-out solid agreement: مِّيثَاقًا غَلِيظًا (4:21) – most solemn covenant. It is not child play who builds a house and destroys it and builds another house. The Quran declares

monogamy as an essential principle; and more than one wife is allowed under strict condition only for solving an emergency social problem. Also, the Quran provides guidelines for divorce. What is called triple Talaq in Sharia is totally against the Quran.

Protecting chastity

When it comes to protecting chastity we normally associate it with females. According to the Quran protection of chastity equally applies to both males and females; that violation leads to criminal punishment equally to both. Wherever the Quran refers to chastity it addresses man first and then the woman. Thisis an important point. If men adhere to chastity in a society then women automatically will bein chastity mode. The Quran describes chastity among the attributes of Momineen: وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ(23:5) – and who are mindful of their chastity. And the Quran declares that: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ(23:1) – Let Us tell you now about the people whose efforts will bear fruit and attain all-encompassing success, in this world as well as in the hereafter. These are the people who accept the truthfulness of Our Laws; and the implementation of which they make the ultimate aim and mission of their lives.It is clear from this that a nation's success or failure or rise or fall depends on its chastity or lack thereof. This is the reality that Dr. Unwin arrive at after a long period of scholarly research. Look at how he puts it:

“Such, in brief but sufficient outline, were the postnuptialregulations of these vigorous societies; such were their methods ofregulating the relations between the sexes. In each case they reduced theirsexual opportunity to a minimum by the adoption of absolute monogamy;in each case the ensuing compulsory continence produced great social energy.The group within the society which suffered the greatest continencedisplayed the greatest energy, and dominated the society. When absolutemonogamy was preserved only for a short time, the energy was only expansive,but when the rigorous tradition was inherited by a number of generationsthe energy became productive. As soon as the institution of modifiedmonogamy, that is, marriage and divorce by mutual consent, became partof the inherited tradition of a complete new generation, the energy, eitherof the whole society or of a group within the society, decreased, and thendisappeared.” [Page 411-412]

Let me mention that when the Quran has imposed limitations on the satisfaction of instinctual emotions then it is not just for societal advancement but also for individual's self-development and strengthening(and moves on to the life of the hereafter) which requires a separate discussion of its own. Therefore, I am limiting my discussion here to only the issue of societal and national rise and fall.

Self-control

As we have seen the Quran allows only one way to satisfy sexual desires and that is by doing the contract of Nikah.The question is: If this opportunity is not available then what to do? The Quran's answer is: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (24:33) – And let

those who cannot afford to marry, live in continence and practice self-control.People have the wrong concept when they think it is impossible for an adult man or woman to practice self-control. They equate sex as physical need just as hunger and thirst. Well, if one is deeply engrossed in work and is thirsty and does not drink water then after a while the thirst becomes unbearable and he has to drink water. If one does not drink water for few days, then death overtakes. Same things will happen if one does not eat for few more days. So, we see that:

1. Hunger and thirst automatically arise. It does not arise due to an intention or thought.
2. If these are not fulfilled, then these cause sickness and lead to emergency situation and eventually to death. That is why in such situation the Quran allows even haram things to alleviate thirst and hunger.

But sexual need is quite different from these. It never arises unless sexual thought originate into the mind. Please remember that sexual desire never arises without its thought. And if sexual desire is not fulfilled then death does not occur.That is why the Quran does not allow it if Nikah is not possible; and it orders to use self-control (24:33) which is possible to achieve because it is under human's control, not under nature's control as it is in the case of hunger and thirst. As for the common belief that if sexual desires are not fulfilled then psychological diseases will occur. This isalso wrong. We saw earlier that the research of psychologistswhich shows that practicing self-control and continence not only does not cause any psychological diseases but in fact increases the creative potentialities of individuals and societies. Psychological diseases occur only when one arouses one's sexual drives by creating all kinds of sexual thoughts and finds unnatural ways of their release.

***

Stopping obscenity

So, fanning the flames of sexual desires and obscenities is the cause of many of the societal issues according to the Quran which modern research has now proved it. Protecting chastity requires self-control. But if the environment is full of obscenities then how to achieve self-control and piety. The Quran proposal a solution that cures its root rather than dealing with its numerous symptoms. It says: قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ(7:33) – O Messenger! Say to the people: "My Sustainer has declared to be Haram indecencies in action or in thought and all those things which debilitate human capabilities.Therefore, the Quran has declared that indecencies in action or in thought are forbidden and has suggested severe punishment for those who spread indecency in the societyjust as it has forbidden fornication and instituted severe punishment for it. It says: إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ(24:19) – Take note that those of you who want to spread such scandals within the Momineen, will be severely punished in this world (according to thedivine laws) as well as in the hereafter. Allah knows how seriously it damages societybut you are not cognizant of it.

To Be Continued

مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزم اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب 1946ء میں سرخپوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں پاکستان میں شمولیت/عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزرات اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز 38-1937ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ کے، تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظم سے پیشگی وقت لیے بغیر ان کی خدمت میں، کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی، پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ، علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اس کا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لیے مناسب افسروں کے انتخاب کے لیے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مرد مجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپرد قلم کیے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔

❁❁❁❁❁

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
06

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web: www.toluislam.org www.facebook.com/talueislam/

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ⑪۲ (16:112)

قوموں پر اس قسم کی تباہیاں کیوں' اور کب' آتی ہیں' اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی جسے خارجی خطرات سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف' ہر سمت سے سامانِ رزق کھنچا چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے خوش حال اور فارغ البال تھے لیکن انہوں نے خدا کی بخشائشوں کی ناقدر شناسی کی (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہوگیا۔ فارغ البالی کی جگہ انہیں فاقے آنے لگے اور ان کا امن' خطرات سے بدل گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔ خدا نے اپنی بخشائشیں نہیں روک لی تھیں' انہوں نے اپنے لئے جو غلط نظام قائم کیا' یہ اس کا نتیجہ تھا (21:11-15؛20:124؛6:44)

(مفہوم القرآن از پرویزؒ)

